ہفت روزہ
الفتح
کراچی

حسن ناصر شہید کی یاد میں۔ اشاعتِ خاص

۱۱-۱۸ نومبر ۱۹۷۱ء



وہ سربلند قلعۂ لاہور میں مرے پیشِ یزیدِ عصر نہ سر جس کا خم رہا ہے

(خالد علیگ)

خالد علیگ

برسی پر

شہیدِ قلعۂ لاہور، الوداع کہ میں
بنا رہوں بھلا کب تک ترے لہو کی پکار
میں پوچھتا ہوں، ترے "بے نمو قبیلے" میں
ترے سوا بھی کہیں تھی صداقتِ کردار؟

لہو لہو مرے فکر و نظر کی تابانی
لہو لہو ہیں مرے حرف و صوت و لفظ و بیاں
لہو لہو مرا لہجہ، لہو لہو آہنگ
لہو لہو مری نظمیں، لہو لہو ہے زباں

میں ایک قرن سے آواز دے رہا ہوں انہیں
مگر یہ لوگ تری برسیاں مناتے رہے
"بڑے خلوص" سے کرتے رہے ہیں یاد تجھے
"بڑے خلوص" سے پھر تجھ کو بھول جاتے رہے

ترے رفیق، ترے ہم سفر، ترے عشاق
یہ تیری یاد کا مرقد سجائے بیٹھے ہیں
انہیں یقین ہی نہیں ہے کہ تو، "تو زندہ ہے"
یہ تجھ کو جنسِ تجارت بنائے بیٹھے ہیں

یہ لوگ کون ہیں، کیا ہیں، کوئی تو سمجھائے؟
نہ ان کے کوئی مقاصد نہ ان کا کوئی اصول!
میں سوچتا ہوں، اس "انبوہِ خود پسنداں" میں
ترا لہو بھی اکارت، میری نوا بھی فضول!

خُدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد :- ۲ شمارہ :- ۲۶

۱۱ - ۱۸ نومبر ۱۹۷۱ء

نگران
شوکت صدیقی
محمود شام

مدیر
ارشاد راؤ

معاونینِ خصوصی
ابراہیم جلیس، افضل صدیقی، عبدالحمید چھاپرا

مجلسِ ادارت
وہاب صدیقی - نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر
غلام نبی بزمی

سرورق :- انور سمیع

بدلِ اشتراک — فی پرچہ، سالانہ، ششماہی
۵۰ پیسے، ۲۵ روپے، ۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے: ۷۵ پیسے، ۳۰ روپے، ۱۶ روپے
بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی قطر : ۷۵ درم
سعودی عرب : ۱۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت
ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی، نرسری کمرشل ایریا
پی، ای - سی - ایچ - ایس کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر :- ارشاد راؤ
مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد - کراچی

عکاس : الطاف رانا

اداریہ

10/XI/71.

چین ہمارے ساتھ ہے

اِس ہفتے کا سب سے اہم واقعہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں تینوں افواج اور وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ افسروں پر مشتمل وفد کی عظیم دوست ملک عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم کامریڈ چو-این-لائی قائمقام وزیر خارجہ کامریڈ چی، چین کی عوامی فوج اور کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں سے کامیاب بات چیت ہے۔ چین نے ایک بار پھر اپنی بھرپور حمایت اور بیرونی جارحیت کی صورت میں پاکستان کے عوام سے مکمل تعاون کا یقین دلاکر ثابت کر دیا ہے کہ چین ہی پاکستان کا سب سے قابلِ اعتماد، مخلص اور سچا دوست ہے۔

یہ چین کے عظیم عوام اور چینی کمیونسٹ پارٹی کی عظمت ہے کہ پاکستان کے حکمرانوں کے بعض غلط اقدامات اور موقع پرستی کی وجہ سے پاک چین دوستی کے بارے میں شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ اُن میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد روس میں کیے جانے والے عوام دشمن معاہدے اعلانِ تاشقند کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ نازک حالات میں سب سے پہلے چین پاکستان کے عوام کے شانہ بشانہ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ جونہی چین کھل کر حمایت کا اعلان کرتا ہے، پاکستان کے رجعت پسند اور سامراج نواز حکمرانوں پر دباؤ ڈالتے ہیں، کہ امریکہ سے رجوع کرو۔ امریکہ، روس اور دوسری بڑی طاقتیں اپنی مکارانہ اور عیارانہ پالیسیوں کی روشنی میں جو رویہ اختیار کرتی ہیں وہ بین الاقوامی آداب اور تعلقات کے منافی ہوتا ہے۔ اس صورت میں پھر چین سامنے آتا ہے اور بے لوث دوستی کا حق پورا کرتا ہے۔

پچھلے دنوں بھارتی جارحیت اور پاکستان دشمن اقدامات نے وطنِ عزیز کی سالمیت کے لئے جو خطرات پیدا کئے روس نے جو رویہ اختیار کیا، برطانیہ نے جو سلوک روا رکھا، امریکی سامراج نے جو دوغلی پالیسیاں وضع کیں اُن کی روشنی میں پاکستان بین الاقوامی سطح پر صرف ایک ہی دوست پر بھروسہ کرسکتا تھا۔ اور وہ چین ہے۔ مسٹر بھٹو نے اس نازک لمحہ پر چین کی حمایت حاصل کرکے بلاشبہ ایک قومی خدمت انجام دی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر یہ کام اُن کے علاوہ کسی اور سے ممکن بھی نہ تھا۔ وہ بجا طور پر اپنے دورے کی عظیم کامیابی پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

حسن ناصر شہید

۱۳ نومبر کو عظیم انقلابی رہنما اور شہید قلعۂ لاہور سید حسن ناصر کا یوم شہادت ہے۔ حسن ناصر کو ۱۹۷۱ء سے پہلے جس روایتی انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے، آج کے تقاضے اس کے برعکس ہیں۔ ماضی میں بلاشبہ شہید حسن ناصر کو نام نہاد انقلابیوں نے جنسِ تجارت بنایا۔ ۱۹۷۱ء اس کی اجازت نہیں دے گا۔ آج سینکڑوں نوجوان، مزدور اور کسان اپنے شہید ساتھی کے مشن کو عملی جامہ پہنانے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہیں۔ وہ حسن ناصر کے راستے پر گامزن ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں منائی جانے والی برسی یقیناً مختلف ہوگی، اور حسن ناصر کو جنس تجارت بنانے والے جدوجہد میں اپنے انجام کو پہنچ چکے ہوں گے ۱۹۷۲ء حسن ناصر کے خون کا خراج مانگے گا۔ مزدور کسان راج کے لئے جدوجہد ہی حسن ناصر کا مشن تھا۔ اور یہی مشن کامیاب ہوگا۔

سنو! آواز آ رہی ہے

جنگ

گلی گلی۔شہر شہر لڑی جائے گی

سامع

سنو آواز آ رہی ہے
پاکستان عظیم ہے
پاکستان عظیم ہے
پاکستان عظیم ہے
پاکستان جاگ رہا ہے
پاکستان جاگ رہا ہے
پاکستان ایک ہے
پاکستان متحد ہے
پاکستان سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے
اس دیوار سے ٹکرانے والا ہر سر پاش پاش ہوگا
یہی سر ٹکرانے والوں کا مقدر ہے۔
پاکستان ہر شخصیت سے بلند ہے، بالا ہے
پاکستان ہر شخصیت سے بلند و بالا رہے گا
سنو! لالن شاہ، پدما، میگھنا اور گنگا کے مانجھیوں کو کہہ رہا ہے ؎

اور کسی نے داب رکھی ہے میرے گھر کی پونجی
پل پل لٹتے کیسے دیکھوں اپنے گھر کی پونجی
؎ اپنے گھر میں رکھ کر میں دھن، دولت، مال، خزانہ
لین دین پرایوں سے کرنے کو ہوا روانہ
؎ دام گرہ میں اور کے سودا کسی کے ساتھ
دھن والا تھا جنم کا اندھا دھویا دھن سے ہاتھ
؎ دریا دریا کنکر رولے من موتی کے اندر
لالن اپنا آپ نہ جانا من موتی کے اندر

سنو! وطن کی سالمیت کو چانکیا کے چیلوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھانے والو! سنو! میگھنا، پدما، سرما اور گنگا کے مانجھیوں کو وطن کی آبرو سے کھیلنے کا درس دینے والو! سنو اب تمہارا پھیلایا ہوا شر اپنوں کے ہاتھوں اپنوں کا لہو بہا رہا ہے!! یہ تمہارا شر تمہیں بھسم کر دے گا!

تم وطن سے دغا کر گئے!!!
تم وطن کو چھوڑ گئے۔
سنو! جو شخص اپنے وطن کا دشمن ہے، وہ اس جہاں میں اور آخرت میں ذلیل و خوار ہوگا۔
یہ وطن، میرا وطن، میرے جسم کی پوشاک ہے۔ میں اپنے تن کی پوشاک کو پھول کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔
سنو! وطن ایک ایسا دوست ہے، اگر تو اُسے چھوڑ بھی دے تو تجھے نہیں چھوڑے گا۔
سنو، وطن عظیم ہے۔
یہ وطن، میرا وطن پاکستان ہے۔
اور اس وطن کی راہ میں قربان ہونے والوں کی محبوبائیں کہہ رہی ہیں۔
"میرے محبوب تو اپنے آپ کو وطن کی راہ میں قربان کر دے
میں اپنی زلفوں کے تاروں سے تیرے لئے کفن بنوں گی
میرے محبوب اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھوں ٹکڑے

پاکستان عظیم ہے

پاکستان عظیم رہے گا

ٹکڑے کرا دو کہ وطن کی عظمت پر آنچ نہ آئے اور پھر میں تمہارے زخموں پر ہونٹوں کا مرہم رکھوں"
سنو! آواز آ رہی ہے۔
"اے خدا مجھے سو بار زندگی عطا کر کہ میں وطن کی آن پر وطن کی محبت میں سو بار مر جاؤں"
؎ زیر شمشیر کریں رقص چلو
کھا کے ہم تیر کریں رقص چلو
رقص وہ جس سے زمیں ہل جائے
خاک میں اپنا عدو مل جائے

کہ وطن کے ہر گوشہ میں جنت کا نظارہ، اور جب تُو وطن کی خاطر جنگ کرے تو تیرے بازو پر تیری ماں، تیری بہن کا آنچل چھا جائے۔ چاند کبھی کونے سے نہیں نکلتا۔ جوانانِ وطن بندوقوں سے نہیں ڈرتے کیونکہ ان کے قدم تو ؎
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم، تجھے یادگار بنا دیا
اور یہ یادگاریں آج بھی وطن کی سرحدوں پر وطن کے جیالوں کی عظمت کا نشان راہ بنی پکار رہی ہیں۔
سب سے پہلے پاکستان
پاکستان! پاکستان، پاکستان
پاکستان زندہ ہے۔ پاکستان کو زندہ رہنا ہے
پاکستان زندہ و جاوید رہے گا۔ پاکستان متحد ہے۔ پاکستان کو متحد رہنا ہے: پاکستان متحد رہے گا۔
پاکستان مستحکم ہے۔ پاکستان کو مستحکم رہنا ہے
پاکستان مستحکم رہے گا
پاکستان زندگی کی جہد میں، پاکستان اس جہد میں سرخرو رہے گا۔ پاکستان کے استحکام پر، پاکستان کی سالمیت پر اندرونی اغیار اور بیرونی دشمن ضرب لگا رہے ہیں۔ کہ سیسہ پلائی دیوار کو ڈھا سکیں۔ لیکن اس سیسہ پلائی دیوار کو ڈھانے کی کوشش کرنے والے سخت غلطی پر ہیں۔
پاکستان اپنی سالمیت اور بقاء کی جنگ کے لئے تیار ہے۔ پاکستان نے امن کی خاطر امن چاہا۔ لیکن اینٹ کا جواب پتھر ہوگا۔ اور یہ جنگ دو قوموں کے درمیان نہیں ہوگی بلکہ یہ دو ملکوں کے عوام کے درمیان جنگ ہوگی۔
سنو! بھیڑیو! یہ جنگ، گلی گلی، کوچہ کوچہ، شہر بہ شہر لڑی جائے گی۔ یہ جنگ ہزار سال تک لڑی جائے گی، اب کوئی تاشقند نہ ہوگا۔ اب گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ بدلے گا۔ ہر پاکستانی اپنے وطن کے دفاع اور عظمت کے لئے جی جان سے لڑے گا۔ کہ خدا نے پاکستان ان کی حفاظت میں دیا ہے، یہ سب پاکستان کے وفادار ہیں، انہوں نے یہ وطن خاک و خون کے دریا عبور کر کے حاصل کیا تھا۔
اس وطن کی مٹی میں لاکھوں معصوم شہداء کا خون رچا بسا ہے۔ اس وطن پر اٹھنے والی ہر آنکھ نکال دی جائے گی، ہر بڑھنے والا ہاتھ قلم کر دیا جائے گا۔ اور ہر پاؤں جنبش سے پہلے شل کر دیا جائے گا۔
فتح پاکستان کا مقدر ہے۔

الفتح



پیکنگ میں پاکستانی وفد اور چین کے وزیر اعظم چو این لائی اور دیگر اعلیٰ حکام کے درمیان مذاکرات ہو رہے ہیں

صدر یحییٰ نے کہا: "میں اقتدار اکثریتی پارٹی کو منتقل کروں گا"

چو این لائی نے بھٹو سے کہا تھا:-

"ہم عوامی حکومت کے قیام سے پہلے پاکستان نہیں آئیں گے"

محمود شام

مسٹر بھٹو کی قیادت میں چین پہنچنے والے اعلیٰ اختیاراتی پاکستانی وفد کے دورے سے موجودہ صورتحال میں چین اور پاکستان اور قریب آگئے ہیں، چین کے سلسلے میں بعض حلقوں میں جو تذبذب اور غلط فہمیاں پائی جاتی تھیں وہ بھی اب یقیناً دور ہو گئی ہوں گی. پاکستان کے لیے جنگ کی صورت حال میں اور غیر ملکی جارحیت کے مقابلے میں تو چین نے حمایت کا اپریل میں ہی اعلان کر دیا تھا مگر مشرقی پاکستان کی صورت حال کے بارے میں اب کھل کر اظہار رائے کیا ہے. اور واضح طور پر انقلابی جدوجہد اور علیحدگی پسندی کی جدوجہد میں امتیاز واضح کیا ہے. میرے نزدیک چین کے قائم مقام وزیر خارجہ مسٹر چی پنگ فی کی تقریر کے یہ جملے قابل غور ہیں. جو برطانوی خبر رساں ایجنسی، رائٹر اور فرانسیسی ایجنسی فرانس پریس نے اپنی رپورٹوں میں دیئے ہیں.

"میں ایک مرتبہ پھر اس موقع پر چین کی حکومت اور عوام کی جانب سے پاکستان کی حکومت اور عوام کا صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، بیرونی جارحیت، مداخلت کاروں اور اندرونی علیحدگی پسندوں سے اپنے ملک کی آزادی، خود مختاری اور علاقائی سالمیت کا دفاع کرنے کی خاطر پاکستان کے عوام سامراجیت اور توسیع پسندی کے خلاف جدوجہد کرنے کی شاندار روایات کے حامل ہیں، حکومت پاکستان اپنی آزاد خارجہ پالیسی پر کاربند ہے اور اس نے ایشیا میں امن کے تحفظ اور افریشیائی استحکام کے فروغ کے لئے کام کیا ہے، بھارت کی حکومت نے انتہائی ڈھٹائی سے پاکستان کے داخلی معاملات میں مداخلت کی ہے اور مشرقی پاکستان کی صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں تخریبی سرگرمیاں جاری رکھیں، اور



۵ نومبر کو پیکنگ میں پاکستان کے وفد اور چینی وزیر اعظم چو این لائی اور قائم مقام وزیر خارجہ چی پنگ فی سمیت اعلیٰ حکام کا ایک گروپ فوٹو۔

وزارت خارجہ کے ایک افسر نے غلط فہمی پھیلائی :-

"چین والے بھٹو سے ناراض ہو گئے ہیں"

پاکستان کو فوج کشی کی دھمکیاں دیں۔ برصغیر کی موجودہ کشیدگی پر چین کی حکومت اور عوام کو گہری تشویش ہے۔ ہم اس اصول کے حامی ہیں کہ کسی بھی ملک کے داخلی معاملات کو خود وہاں کے عوام ہی حل کر سکتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا مسئلہ پاکستان کا داخلی معاملہ ہے۔ جس کا معقول حل خود پاکستان کے عوام ہی تلاش کر سکتے ہیں۔۔۔۔

ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں، کہ پاکستان کے عوام کی بھاری اکثریت محب وطن ہے اور وہ اتحاد اور ملکی وحدت کا تحفظ کرنا چاہتی ہے پاکستان کے عوام داخلی انتشار و تفریق اور بیرونی مداخلت کے مخالف ہیں ہمیں امید ہے کہ پاکستان کے عوام اپنے اتحاد کو مضبوط کریں گے اور وہ اپنی مشکلات پر قابو پانے اور اپنے مسائل حل کرنے کے لئے مشترکہ کوششیں کریں گے"۔

قائمقام چینی وزیر خارجہ کی اس تقریر کے وقت چین کے وزیر اعظم مسٹر چو این لائی بھی موجود تھے۔ یہ تقریر اس ساری گفتگو جو ان تین روزہ ملاقاتوں میں ہوئی اور اس کے علاوہ مارچ سے لے کر اب تک پاکستان چین کے سفارتی تبادلۂ خط و کتابت اور چین کی اپنی سفارتی معلومات کے مطابق مشرقی پاکستان کی صورت حال کے بارے میں ایک ٹھوس نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہے جس کے مختلف اہم پہلو یہ ہیں۔

(۱) مشرقی پاکستان میں جو واقعات ہوئے، اس کی بنیاد اندرونی علیحدگی پسندوں نے رکھی تھی۔ اور یہ کوئی انقلابی تحریک نہیں تھی، چین نے واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ وہ ایک پاکستان کا حامی ہے۔ اور پاکستان کے عوام کی اکثریت محب وطن ہے۔

(۲) اس سے یہ "لائن" بھی ختم ہو جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان میں مکتی فوج کے کسی حصے کو بھی چین کی حمایت حاصل ہے اور چین انہیں اسلحہ دے رہا ہے۔

(۳) چین کی اتنی کھلی حمایت اور امداد کے بعد۔ پاکستان میں ایسے افراد اور جماعتوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیئے جو در پردہ یا کھل کر چین کی مخالفت کرتی ہیں۔

(۴) پاکستان میں جو لوگ بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں بھی اب آنکھیں کھول کر کوئی واضح نقطہ نظر اختیار کرنا چاہیئے۔ اور مشرقی و مغربی حصے کے محب وطن بائیں بازو والوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد ہونا چاہیئے۔ کیونکہ پاکستان کے ایک رہتے میں ہی اس خطے کے محنت کشوں کی بقاء ہے، ورنہ مجیب الرحمٰن قیادت کا خلاء پُر کرتے رہیں گے، اور ایسے حالات پیدا ہوتے رہیں گے جس میں لاکھوں بے گناہ کبھی نسل پرستوں اور کبھی فوج کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہیں۔

دنیا بھر نے اس سرکاری وفد کے مسٹر بھٹو کی قیادت میں جانے کو اہم اور نتیجہ خیز قرار دیا ہے۔ اس سے پاکستان میں ان حلقوں پر بھی اوس پڑ گئی جو کہہ رہے تھے۔ بھٹو۔ صرف چین کا نام لیتا ہے، چین بھٹو کو پسند نہیں کرتا۔ خود وزارت خارجہ کے ایک رکن نے پیکنگ میں کہا کہ پاکستان کے ایک ممتاز لیڈر اور سابق وزیر خارجہ کے وفد کے قائد ہونے سے اس وفد کی اہمیت ظاہر ہے۔ وزارت خارجہ کے ایک انتہائی اہم رکن نے جنوری ۱۹۷۱ء میں ڈھاکہ میں مسٹر بھٹو اور چین کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سنگاپور سے لوٹے تھے۔ بھٹو مجیب سے بات چیت کے لئے ڈھاکہ گئے ہوئے تھے۔ وزارت خارجہ کے اس انتہائی اعلیٰ افسر نے بھٹو صاحب سے کہا کہ "چین آپ سے ناراض ہے"۔ اور وہ اس کی مختلف توجیہات پیش کرتے رہے۔

یہ غلط فہمی پیدا کرنے کے علاوہ کوئی اور کوشش نہ

باقی صفحہ ۴۱ پر ملاحظہ فرمائیں

تصویروں کی کہانی

یہ تصویریں چین کے سب سے بڑے اخبار "پیپلز ڈیلی" کے شکریئے کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔ پیپلز ڈیلی نے ہفتہ کے روز پاکستانی وفد کی آمد کی خبریں صفحہ اوّل پر شائع کیں اور ایک تصویر صفحہ اوّل پر دو تصاویر آخری صفحے پر شائع کیں۔ یہ تصاویر روزنامہ "حریت" نے خصوصی ذرائع سے حاصل کی تھیں۔ ہم اُس کے شکریئے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔



۵ر نومبر کو جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیکنگ میں پاکستان کے اعلیٰ اختیاری وفد کا شاندار استقبال کیا گیا

۲۲
خاندان
تفصیلات بھی

انشورنس، گیس، سٹیل، بنک، پبلسٹی سب پر قبضہ

فینسی

اجارہ داری میں سب سے آگے

الفتح رپورٹ

فینسی گروپ پاکستان کے کاروباری افق پر نسبتاً ذرا دیر سے ابھرا۔ آج کل یہ خاندان پاکستان کے بڑے سرمایہ داروں میں گیارہویں نمبر پر ہے۔ انشورنس کمپنی اور بنکوں کے اثاثوں کی قیمت کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو یہ گروپ بہت اوپر آجاتا ہے۔ اس لحاظ سے انہیں چوتھا نمبر دیا جاتا ہے۔ فینسی گروپ کی مندرجہ ذیل پانچ کمپنیاں ہیں۔

۱۔ نیو جوبلی انشورنس کمپنی۔
۲۔ کراچی گیس کمپنی۔
۳۔ اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان۔
۴۔ کامرس بنک لمیٹڈ۔
۵۔ پاک کروم مائینز۔

فینسی نے انڈسٹریل مینجمنٹ کے نام سے ایک ادارہ بنا رکھا ہے جو کراچی گیس اسٹیل کارپوریشن اور کروم مائینز کا کاروبار کرتا ہے۔ فینسی کی سب سے پہلی کمپنی جو کراچی اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹر ہوئی وہ نیو جوبلی انشورنس کمپنی تھی اور اس کا اداشدہ سرمایہ صرف اکیس لاکھ تھا۔ یہ ۱۹۵۵ء کی بات تھی، ۱۹۶۹ء میں یعنی چودہ سال بعد یہ سرمایہ ۴۹۲ لاکھ تک جا پہنچا۔

پاکستان کے پانچ سالہ منصوبوں کے دوران فینسی گروپ کی ترقی کی رفتار یہ رہی۔

سال		اداشدہ سرمایہ (کروڑوں میں)
۱۹۵۵	———	۲۱ ء
۱۹۶۰	———	۲ء ۶۷
۱۹۶۵	———	۳ء ۶۷
۱۹۶۹	———	۴ء ۹۲

دوسرے سرمایہ داروں کی طرح فینسی گروپ نے بھی ۶۰۔۱۹۵۵ء کے دوران بے پناہ منافع کمایا۔ اس عرصہ میں کراچی گیس کمپنی اور اسٹیل کارپوریشن معرض وجود میں آئیں۔

فینسی گروپ کا اداشدہ سرمایہ کے لحاظ سے سال بہ سال ترقی کی رفتار یہ رہی۔

سال	نیو جوبلی انشورنس	کراچی گیس	اسٹیل کارپوریشن	کامرس بنک	پاک کروم	میزان
۱۹۵۴	-	-	-	-	-	-
۱۹۵۵	۲۱	-	-	-	-	۱۷۱
۱۹۵۶	۲۱	۱۵۰	-	-	-	۱۷۱
۱۹۵۷	۲۱	۱۵۰	-	-	-	۱۷۱
۱۹۵۸	۲۱	۱۵۰	-	-	-	۱۷۱
۱۹۵۹	۲۱	۱۵۰	-	-	-	۱۷۱
۱۹۶۰	۲۱	۱۵۰	۹۶	-	-	۲۶۷
۱۹۶۱	۲۱	۱۵۰	۹۶	-	-	۲۶۷
۱۹۶۲	۲۱	۱۵۰	۹۶	-	-	۲۶۷
۱۹۶۳	۲۱	۱۵۰	۹۶	۱۰۰	-	۳۶۷
۱۹۶۴	۲۱	۱۵۰	۹۶	۱۰۰	-	۳۶۷
۱۹۶۵	۲۱	۱۵۰	۹۶	۱۰۰	-	۳۶۷
۱۹۶۶	۲۱	۱۵۰	۹۶	۱۰۰	-	۳۶۷
۱۹۶۷	۲۱	۱۵۰	۱۱۱	۱۰۰	-	۳۸۲
۱۹۶۸	۲۱	۱۵۰	۱۱۱	۱۰۰	۳۵	۴۱۷
۱۹۶۹	۲۱	۲۵۰	۱۱۱	۱۰۰	۳۵	۴۹۲

کراچی گیس کمپنی

سوئی گیس کمپنی کے ساتھ ہی قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کراچی کے فیڈرل ایریا کے لئے سوئی گیس کی تقسیم کے لئے ایک علیحدہ ادارہ ہونا چاہیئے۔ پی آئی ڈی سی کی سرپرستی میں اسے ۱۹۵۵ء میں رجسٹر کروایا گیا۔ شروع میں اس کا اداشدہ سرمایہ صرف ایک لاکھ تھا۔ بعدازاں اسے بڑھا کر ایک کروڑ کر دیا گیا اور پھر جون ۱۹۵۶ء میں یہ سرمایہ ڈیڑھ کروڑ تک پہنچ گیا۔

نیو جوبلی انشورنس کمپنی

۱۹۵۳ء میں معرض وجود میں آئی اور اب میکلوڈ روڈ کراچی پر اس کی ذاتی عظیم الشان عمارت ہے جسے عرف عام میں جوبلی انشورنس ہاؤس کہا جاتا ہے۔ یہ کمپنی لائف اور جنرل دونوں کا کام کرتی ہے پاکستان کی دوسری انشورنس کمپنیوں کے مقابلے میں اسے لائف میں چوتھی اور جنرل میں چھٹی پوزیشن حاصل ہے۔

کراچی گیس کمپنی نے ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۱۷۱۷ P سے جاپانی کرنسی میں ۲۹ لاکھ روپے کا قرضہ حاصل کیا یہ قرضہ سولہ ششماہی قسطوں میں ادا کیا جانا تھا۔ اس قرضے کے لئے کمپنی نے بینک کی باقاعدہ گارنٹی دی تھی۔

اسٹیل کارپوریشن آف پاکستان

یہ کمپنی بھی ۱۹۵۵ء ہی میں قائم ہوئی۔ یہ کمپنی لوہے اور اسٹیل کا سریہ، اینگلز، فلیٹس، چینل، ٹرنر، جوڑ اور گلوانائزڈ وائر بناتی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اس کمپنی نے لانڈھی (کراچی) میں ایک عدد اسٹیل رولنگ اور سلیٹنگ مرپ اور وائر راڈ پلانٹ نصب کیا۔ اس کے بعد کمپنی کو پبلک کمپنی میں تبدیل کر دیا گیا اور ۲۷ لاکھ روپے کے حصص برابر قیمت پر بیچے گئے۔ اس کے علاوہ ایک جرمن فرم کلوکنز انڈسٹریز کو بھی کچھ حصص دیئے گئے مالہ انہوں نے جو مشینری دی تھی۔ اس کی قیمت ادا ہو سکے، ۱۹۶۵ء میں اس کمپنی کا ادا شدہ سرمایہ تقریباً ۹۶ لاکھ تھا۔ جو ۱۹۶۶ء میں بڑھا کر ایک سو گیارہ لاکھ کر دیا گیا۔

فینسی خاندان کی ایک ذیلی کمپنی جس کے انچارج جی، ایچ، فینسی ہیں۔ اس کمپنی کا کاروبار چلاتی ہے، بیکو لمیٹڈ اور اسٹیل کارپوریشن، پاکستان کی اسٹیل مارکیٹ میں بہت اہم مقام رکھتی ہیں۔



کامرس بینک لمیٹڈ

۱۹۶۳ء میں قائم ہوا اور اسی سال کام شروع کر دیا۔ پہلے سال کے دوران اس بنک کی صرف سترہ شاخیں تھیں۔ لیکن ۱۹۶۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۶۶ ہو گئی اور ۱۹۶۷ء میں اور اضافہ ہوا یعنی ۹۷ ہو گئیں۔ کامرس بنک کاروبار کے لحاظ سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں کر سکا۔ دراصل شروع ہی سے یہ بنک غلط قسم کے اداروں کو قرض دے بیٹھا اور آج تک اس چکر سے نہ نکل سکا۔ اس کے خراب گاہکوں میں کراچی روڈ ٹرانسپورٹ سرفہرست ہے۔

کالونی گروپ کی طرح فینسی گروپ میں بھی اختلافات شروع ہو گئے تھے۔ لیکن امیر علی فینسی اور جی ایچ فینسی نے لڑائی جھگڑے کی بجائے صلح صفائی سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا جی ایچ فینسی صرف اسٹیل کارپوریشن کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور باقی ادارے امیر علی فینسی کے ماتحت ہیں۔ اور خاندان کے سربراہ اب بھی امیر علی فینسی ہی سمجھے جاتے ہیں۔

اسٹیل کارپوریشن سمیت فینسی گروپ میں ڈائریکٹروں کی تعداد ۳۰ ہوتی ہے۔ ان میں سے ۱۴ فینسی گروپ کے اپنے ہی خاندان کے افراد ہیں۔

فینسی خاندان کے افراد کے نام	ڈائریکٹروں کی تعداد
۱- امیر علی ایچ فینسی	۴
۲- حسن اسمٰعیل مدعا سکر والا	۱
۳- ابراہیم اسمٰعیل ویرجی	۱
۴- جی۔ ایچ فینسی	۴
۵- عبدالرحمٰن ابراہیم ماجی	۱
۶- بدرالدین	۱
۷- بہادر علی ایچ فینسی	۱
۸- نور علی ایچ فینسی	۱
میزان	۱۴

اس ادارے کی خاصیت یہ ہے کہ یہ اپنے بڑے بڑے ملازمین کو خاصی معقول تنخواہیں دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی تحقیقی اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی بھی دل کھول کر کرتا ہے۔

مسٹر امیر علی فینسی اس گروپ کے روح رواں ہیں اور

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیے





چندے کی رقم بڑے سومنات ہڑپ کر جاتے ہیں

ابو آدم

خودساختہ صالحین کی پراسرار تنظیم جماعتِ اسلامی کو عوامی انتخابات میں قومی اسمبلی کی صرف چار نشستیں ملی تھیں۔ اور اس سازشی جماعت نے سادہ لوح علماء سے اسلامی سوشلزم کے خلاف جو فتوے حاصل کیے تھے اُن کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ اب اس جماعت نے چور دروازے سے اقتدار پر قبضہ جمانے کی کوششیں کی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی ایک بھی نشست جماعت کو نہیں مل سکی تھی لیکن اب وہاں ضمنی انتخابات میں ایسے حلقوں سے اس کے امیدوار کامیاب قرار پائے ہیں جہاں انھیں انتخابات کے وقت کل ووٹوں کا دس فیصد حصّہ بھی نہیں ملا تھا۔ جماعت کے "دم توڑتے ہوئے ترجمان" جسارت کی اطلاعات کے مطابق جماعت کے رضاکاروں نے ضمنی انتخابات میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اس سے قبل مشرقی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے نمائندے دیوان وراثت حسین پوری قوم پر جماعت کے رضاکاروں کے بھیانک مظالم کا پردہ چاک کر چکے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ دہشت گردی اور بربریت کا سہارا لے کر جماعت نے اپنے امیدواروں کے حق میں فضا کو سازگار کیا ہے۔ مخالفین کو دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ اُن کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ اور انسانی خون بہایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا جا رہا ہے کہ صالحین کی جماعت قومی اسمبلی میں چند نشستوں کی مالک بن بیٹھے اور اپنے گورے سامراجی آقاؤں کے اشارہ پر پاکستان میں عوامی انقلاب کا راستہ روک سکے۔

اسلام نے اگر یہی تعلیم دی ہے جس پر مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی عمل پیرا ہے تو علماء و مفتیانِ کرام کو یہ بتانا ہوگا کہ قرآن کا اسلام جماعتِ اسلامی کے اسلام سے کیوں مختلف ہے اور دونوں میں سے کون سا اسلام اصلی ہے

اسلام تو یہ کہتا ہے کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اُسے اجرت دے دو۔ لیکن جماعت اسلامی کے چیتھڑے جسارت میں آج بھی کئی ملازمین کو ماہ ستمبر کی تنخواہیں نہیں ملی ہیں۔ اس اخبار سے اب تک درجنوں ملازمین کسی جرم کے بغیر نکالے جا چکے ہیں۔ اس اخبار میں ایسے ایسے صالحین نے سرمایہ لگایا ہے جو سزا یافتہ ہیں۔ ٹیکس بچانے کے لئے جھوٹے اکاؤنٹ بناتے ہیں۔ عیاشی کا سامان فروخت کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور غریبوں کے کپڑے دھونا عیب خیال کرتے ہوئے صرف سرمایہ داروں کے لباس ڈرائی کلین کرتے ہیں۔ اس اخبار میں ایک ایسے شخص نے بھی سرمایہ لگایا تھا جو دو دو لیڈی سیکریٹریوں کے نرغہ میں رہتا ہے اور یہ لیڈی سیکریٹریاں یقیناً پردہ دار خواتین نہیں بلکہ دلربا ادائیں دکھانے والی نوجوان لڑکیاں ہیں۔ جماعت اسلامی کے مکر و فریب کا شکار ہو جانے والے سیدھے سادے مسلمان جماعت کے کارکنوں کو مٹھی بھر آٹا بھی دیتے ہیں، آنے دو آنے اور روپے دس روپے سے مالی مدد بھی کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے اسلام دُشمن لٹریچر بھی خریدتے ہیں اور عید الضحیٰ پر قربانی کی کھالوں کا تحفہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان بیچاروں کو معلوم نہیں کہ اسلام کی خاطر وہ جو عطیات دے رہے ہیں اُنھیں جماعت اسلامی کے ناخدا ایسے اخبار پر لگاتے ہیں جو ہر صبح ہزاروں جھوٹ شائع کرتے ہیں اور دوسرے مسلمانوں کا گلا کاٹنے کی تحریک چلاتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اس سرمایہ سے جماعت کے لیڈرانِ کرام اپنے عیش و آرام کا بندوبست کرتے ہیں۔ وہ نفیس کپڑے پہنتے ہیں تین تین لاکھ روپے کے بنگلے بناتے ہیں اور بیس بیس ہزار روپے کی کار خریدتے ہیں۔ عام مسلمانوں اور دولت مند مسلمانوں سے حاصل کی جانے والی لاکھوں روپے کی رقم میں سے جماعت کے ہی اخبار میں کام کرنے والے نادار ملازمین کو تنخواہیں تک نہیں ملتیں۔ اس لیے کہ تمام رقم چند بڑے بڑے سومناتوں پر خرچ ہو جاتی ہے۔ چھوٹے بتوں کے لئے کچھ نہیں بچتا اور جتنے بھی سومنات ہیں اُن سب کے بڑے بڑے پیٹ ہیں۔ یہ دوزخ کبھی نہیں بھر سکتی اسی لئے غریب ملازمین کو اُن کی تنخواہیں نہیں ملتیں۔ ان ملازمین کے دُوسرے حقوق بھی ہیں۔ قانون نے ان کے لئے بہت سی سہولتوں کا اعلان کر رکھا ہے۔ لیکن یہ سہولتیں کون دے۔ ہم ایسے بعض مالکانِ اخبارات کو جانتے ہیں جو صالحین نہیں لیکن اپنے ملازمین کو وقت پر تنخواہ دیتے ہیں اور قانون کے تحت متعدد دوسری سہولتیں بھی مہیا کرتے ہیں مگر واہ رے جماعت اسلامی تو ان سرمایہ داروں سے بھی آگے نکل گئی۔

جسارت میں جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، اور ہوگا، وہ سب اسلام کے نام سے ہوا اور ہو رہا ہے۔ اگر کسی دُوسرے اخبار میں خصوصاً کسی اشتراکی اخبار میں ایسا ہی ہو تو جماعت کی بغل بچہ نیشنل یونین آف جرنلسٹ اس کو استحصال کا نام دینے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرے گی۔ درحقیقت جماعت والوں کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا نظر آ جاتا ہے اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ یہ جماعت مختلف شہروں سے کئی اخبارات و رسائل نکالتی ہے۔ کسی دوسری مذہبی یا سیاسی جماعت کو اتنے زیادہ اخبارات نکالنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جماعت کے سوا کسی بھی تنظیم کا دامن بہت زیادہ داغدار نہیں۔ جماعت کا پورا لباس ہی داغدار ہے اور اُسے اخبارات و رسائل کی اس لئے ضرورت ہے کہ وہ جماعت کے اصل روپ کو عوام سے چھپائے رکھیں اور مخالفین پر کیچڑ اچھال کر سادہ لوح عوام کو پیچیدہ معمّوں میں الجھا دیں تاکہ جماعت اسلامی کے شیطانی خد و خال کوئی نہ دیکھ سکے۔



"میں چھ جماعتوں کے سمجھوتہ سے مطمئن نہیں ہوں" (نورالامین) ——— (ایک خبر)



جیل خانے — جرائم کی تربیت گاہیں

نعیم آروی

"۱۲ جنوری ۱۹۷۰ء کی سرد اور طویل رات شروع ہو چکی ہے۔ کراچی سنٹرل جیل کی بیرکیں گہری تاریکی میں لپٹی ہوئی ہیں۔ اندر قیدیوں کی ایک دنیا سو رہی ہے۔ باہر ایک سنگین اور بے رحم خاموشی منجمد ہو کر رہ گئی ہے۔ رات کے پہلے پہر کے سکوت کو ماڑی سے بلند ہونے والی آواز وقفے وقفے سے توڑ دیتی ہے "سب ٹھیک ہے"؟

بیرکوں کے پہریدار جواب دیتے ہیں "سب ٹھیک ہے"؟ پہریداروں کی دلخراش آواز سے کچی نیند سونے والے قیدی بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ میری بیرک کے ایک کمرے میں قتل کے مقدمے میں ماخوذ دو قیدی ہیں۔ ایک زمین پر لیٹا بے اطمینانی سے کروٹیں بدل رہا ہے، دوسرا شدید بے چینی کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔ ان کے چہرے پر بے بسی طاری ہے۔

ٹہلنے والے قیدی کی عمر تقریباً ۲۰ سال کی ہے۔ میں خاموشی سے لیٹا ہوا اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہوں، وہ ایک دم سے میری طرف آتا ہے۔ اور ہاتھ ملتے ہوئے بڑبڑانے لگتا ہے "خدا گواہ میں نے قتل نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں، پولیس نے کیس کو مضبوط بنانے کے لئے بلاوجہ مجھے پھانس لیا ہے اب کیا ہوگا میری بات پر کون یقین کرے گا۔ میری ماں، میری جوان بہن کا کیا بنے گا؟" بات کرتے کرتے اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے اس طرح سے گھورنے لگتا ہے۔ جیسے میں ہی اسکی امید کا آخری سہارا ہوں"۔

مذکورہ بالا بیان کراچی کے ایک سیاسی قیدی امیر حیدر کا ہے۔ جسے جنوری ۱۹۷۰ء میں گرفتار کر کے کراچی سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ اس نے بتایا کہ دونوں قیدیوں سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے اس بات پر پکا یقین ہو گیا کہ وہ دونوں بے قصور ہیں۔ نوجوان قیدی تو بالکل بے قصور معلوم ہو رہا تھا۔ اصل مجرم نہیں ملے چنانچہ انتقامی کارروائی کے لئے انہیں پھانس لیا گیا۔ ان کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ چھ ماہ سے مقدمہ چل رہا تھا۔

کراچی سنٹرل جیل سے رہا ہونے والے ایک دوسرے قیدی طاہر علی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے جیل کے کھانے کے متعلق تکلیف دہ انکشاف کیا "جیل جانے کا میری زندگی میں پہلا اتفاق تھا۔ شام کو پانچ بجے ایک مقدم" (سرخ ٹوپی والا قیدی، جو دوسری تمام قیدیوں سے ممتاز ہوتا ہے) کھانا دے گیا۔ دو پتلی پتلی چپاتیاں، مسور کی پانی جیسی دال اور کدو کی انتہائی بدمزہ سبزی کھانے کا برتن انتہائی گندہ تھا۔ کھانے سے بدبو نکل رہی تھی۔ روٹی کا ایک نوالہ لیا تو سارا منہ ریت سے بھر گیا۔ خدا جانتا ہے کہ کس طرح جیل کے پہلے دن کھانا زہر مار کیا۔ ایک ہفتے بعد میرا ایک عزیز مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے اس سے گڑگڑا کر درخواست کی کہ وہ میرے لئے پسی ہوئی مرچوں کا ایک ڈبہ لا دے، دوسرے ہفتے اس نے مرچوں کا ایک ڈبہ لا کر دیا۔ جب تک وہ ڈبہ میرے پاس رہا۔ میں نے جیل کی سبزی کو ہاتھ نہیں لگایا مرچوں کے ساتھ کرکری چپاتیاں کھاتا رہا۔"

فیصلے کے انتظار میں ہی کتنی سال قید میں گزر جاتے ہیں

پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما اور ممتاز اداکار طارق عزیز کو بھی جیل یاترا کا اتفاق ہوا "میرے ارد گرد کچھ اخلاقی مجرم بیٹھے ہوئے تھے۔ بکرے کا بلب جل رہا تھا۔ اور ایک افسردہ سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اخلاقی مجرموں کی حالت پر بڑا رحم آیا۔ ان کے چہرے پر انسان کی ازلی سادگی اور معصومیت تھی۔ ان میں سے ایک شخص تو بار بار کہہ رہا تھا "میں بے قصور ہوں۔ خدا کے لئے مجھے گھر جانے دو"۔

طارق عزیز نے ایک دوسرا واقعہ بیان کیا۔ ہماری کوٹھری کے عقب میں قتل میں ماخوذ عورتوں کا وارڈ تھا۔ ایک عورت کا پانچ چھ سال کا ایک بچہ بھی تھا۔ اکثر رات کے سناٹے میں اس بچے کے رونے کی آواز میرے جسم و جاں کو لرزا دیتی۔ بھوک کی وجہ سے وہ بہت کمزور اور لاغر دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد تھا۔ اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے چھوٹی چھوٹی معصوم آنکھوں میں دنیا جہان کا ڈر اور خوف سمٹا ہوا تھا۔ قتل اس کی ماں نے کیا تھا۔ سزا اس کے بچے کو مل رہی تھی اس چھوٹے سے بے گناہ بچے کی دنیا میں جیل کا ایک نیم تاریک کمرہ اور تھوڑی سی روشنی تھی۔ ماں قاتل تھی مگر اس کے بچے کا کیا قصور تھا۔ اسے کس بات کی سزا دی جا رہی تھی؟

طارق عزیز نے بتایا کہ "جیل مینول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کچے قیدیوں سے جسمانی مشقت لی جاتی ہے۔ انہیں کام کرنے کے لئے باہر بھیجا جاتا ہے۔ اور پیسے جیل کے حکام اپنی جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ پاکستان کی ہر جیل پر اگر چھاپہ مارا جائے تو منوں کے حساب سے افیون، چرس اور شراب کی بوتلیں ملیں گی"۔

عوامی رہنما معراج محمد خان نے انکشاف کیا۔ "مجھے جیل جانے کا بار بار تجربہ ہوا۔ جہاں گیا۔ ایک جیسا مجرمانہ ماحول ملا۔ جیلیں اصلاح گھر نہیں جرائم کی دنیا ہیں آخری بار جب جیل گیا تو مجھے ایسی جگہ رکھا گیا۔ جہاں چرس استعمال ہوتی تھی۔ جیلوں میں قیدیوں کو عادی مجرم بنانے کا کام بڑی انہماک سے کیا جا رہا ہے اسمگلروں اور عادی مجرموں کو بی کلاس دی جاتی ہے۔ ہمارا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ پھر بھی ہمیں عام قیدیوں کی طرح رکھا گیا اگر جیل کے حکام سے کہا جاتا تو وہ ڈھٹائی سے قانون کا حوالہ دیتے۔ ایسی کوئی دفعہ موجود نہیں"۔

کراچی سنٹرل جیل کے ایک کچے قیدی جن کا مقدمہ زیر سماعت تھا محمد عمر نے بتایا۔ کراچی جیل میں ہمارے ساتھ بڑی ناانصافی کی جاتی ہے۔ ہمارے مقدموں کے فیصلے میں برسوں لگ جاتے ہیں پیشی کے دن سپاہیوں کو رشوت دینی پڑتی ہے پھر جا کر گاڑی میں جگہ ملتی ہے۔ سال چھ مہینے کے بعد ثبوت نہ ملنے کی صورت میں اکثر کچے قیدی رہا کر دیتے جاتے ہیں۔ اس طرح مقدمے کی سماعت کے دوران عدالتی فیصلے کے بغیر سال چھ مہینے کی قید کی سزا مفت بھگتنی پڑتی ہے۔ کچے قیدیوں کے ساتھ اس بے انصافی کا تدارک آج تک نہیں کیا جا سکا اس کے علاوہ کچے قیدیوں سے عادی مجرموں کی طرح سخت مشقت کا کام لیا جاتا ہے مجھ سے گٹر کا پانی نکلوا کر فرش کی لپائی کروائی جاتی ہے۔ یہ بڑا گندہ کام ہے۔ بڑی بدبو ہوتی ہے۔ بے شمار قیدی اس کام کے دوران بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ان کا علاج نہیں کیا جاتا۔ ہفتوں، مہینوں اس عالم میں گذار دیتے ہیں۔ دوا کے لئے رشوت دینی پڑتی ہے۔ با اثر اور متمول قیدیوں کے لئے ہر قسم کی آسائشیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ ان سے مشقت کا کام نہیں لیا جاتا۔ معمولی نزلہ بخار میں انہیں فوراً اسپتال بھیج دیا جاتا ہے۔ غریب قیدی مر جائیں ان کا پرسان حال کوئی نہیں"۔

۲۹ اکتوبر کو کراچی سنٹرل جیل میں قیدیوں کے درمیان زبردست ہنگامہ ہوا۔ تصادم کے دوران جیل حکام کے بعض منظور نظر، قیدیوں نے پتھروں، ڈنڈوں، درخت کی شاخوں اور چاقوؤں کا آزادانہ استعمال کیا۔ جیل کی مسلح گارڈ نے اس تصادم کو دبانے کے لئے روایتی انداز میں لاٹھی، ڈنڈے بجائے آنسو گیس کے گولے چھوڑے اور ہوائی فائرنگ بھی کی ہنگامہ اپنے وقت پر ختم ہوا، اور اس میں بے شمار قیدی شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچائے گئے۔ اس واقعہ کی تحقیقات جاری ہے۔ تحقیقات کے بارے میں ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں البتہ اخبارات کی اطلاع کے مطابق اب تک جن قیدیوں سے انٹرویو لیا گیا۔ ان میں سے صرف دو یا تین قیدیوں نے اس واقعہ کی ذمہ داری جیل حکام پر ڈالی ہے۔ بقیہ قیدیوں نے جیل حکام کو بری الذمہ قرار دیا ہے لیکن یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ جن قیدیوں نے جیل حکام کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔ ان کی اکثریت سرخ ٹوپی والے مقدم حضرات پر مشتمل ہے۔ جیل کی یہ مخلوق جیل حکام کی دست راست تسلیم کی جاتی ہے۔ پھر یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ان قیدیوں کو تحریری گواہی دینے کے بعد دوبارہ اسی جیل میں جانا ہے جس کے اندر باہر کا قانون نہیں چلتا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے ذمہ دار افراد یہاں کے بے تاج بادشاہ ہوتے ہیں۔

کراچی جیل کے اس حالیہ ہنگامے کے متعلق ۳ نومبر کے مارننگ نیوز میں ایک خبر شائع ہوئی۔ اصل حالات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اس خبر کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ "زیادہ تر قیدیوں نے اس بات کی شکایت کی کہ حکام نے کچھ قیدی کو ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ اور جو اس سے فائدہ اٹھا کر بے دھڑک جیل کے ضابطوں کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نظم و ضبط کا خاتمہ ہو گیا"۔ "یہ بھی معلوم ہوا کہ جیل کے حکام تحقیقات کی راہ میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ چند اہم عینی گواہوں کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ انہیں اس بات کا خوف ہے کہ اگر عینی گواہ پیش ہو گئے تو حکام کی دھاندلی کا بھانڈہ پھوٹ جائے گا"۔

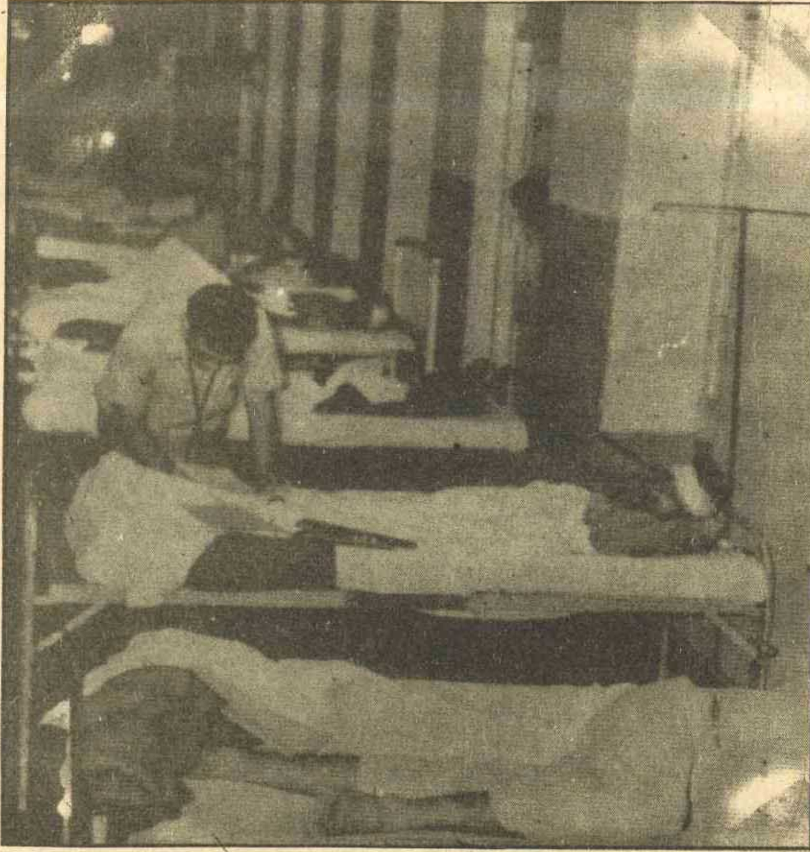
ایک اردو روزنامہ میں اس بات کا بھی انکشاف کیا گیا کہ "مراعات یافتہ قیدیوں کے ذریعہ جیل کے حکام چرس اور جوئے کا کاروبار کراتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں جیل کے اندر ہر قسم کی آزادی دی گئی تھی۔ اور وہ دوسرے قیدیوں سے جانوروں کی طرح سلوک کرتے تھے"۔

ان دنوں کراچی جیل میں چھ سیاسی رہنما بھی نظر بند ہیں انہوں نے جیل کے اندر ہونے والی دھاندلیوں کے خلاف حکومت سندھ کے ہوم سیکرٹری کو ایک درخواست بھیجی ہے۔ جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ حالیہ ہنگامے کی تحقیقات اعلیٰ سطح پر کرائی جائے۔ ۲۳ اکتوبر کو ایک سیاسی نظر بند تاج محمد خٹک کو زدوکوب کرایا گیا۔ جیل کے اندر گروہ بندی اور علاقائی تعصب کی فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ ہماری رائے میں جیل کے اس ہنگامے کے پیچھے عام قیدیوں کے اندر پائی جانے والی بے اطمینانی بھی ہے۔ جس کا اصل سبب یہ ہے کہ جیل کے اندر ہزاروں قیدی بے شمار مشکلات سے دوچار ہیں۔ انہیں ناقص غذا دی جاتی ہے۔ قیدیوں کے اندر مریضوں کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ ان کے علاج و معالجے کا انتظام ناکافی بلکہ "نہیں" کے برابر ہے۔ ہسپتال سے تجویز کی جانے والی ادویہ مریضوں کو مہیا نہیں کی جاتیں۔ جیل کے اندر کچے قیدیوں کی اکثریت ہے لیکن ان کے مقدموں کا فیصلہ مناسب وقت پر نہیں ہوتا۔ وہ جیل کے اندر چار چار پانچ پانچ سال سے پڑے سڑ رہے ہیں۔ عدالتوں کے اندر قیدیوں کو پہنچانے کا انتظام ناکافی ہے۔ جس کی وجہ سے عدالت کے احاطے میں کئی بار ہنگامے ہو چکے ہیں"۔

یہ ہیں چیدہ چیدہ چند واقعات جن سے کراچی جیل کے اندر کی "تاریک دنیا" کے حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اگر مذکورہ بالا واقعات کو اکٹھا کر لیا جائے تو چند ایسے ٹھوس مگر تلخ حقائق سامنے آئیں گے۔ جن سے یہ پتہ لگانا آسان ہو جائے گا۔ کہ کراچی جیل خصوصاً اور پاکستان بھر کی جیلیں عموماً جرائم کی آماجگاہ کس

معراج محمد خان

کوھر جیل میں "مجرمانہ ماحول" ملا



کراچی جیل کے حالیہ ہنگامے میں زخمی ہونے والے قیدی مقامی ہسپتال میں زیر علاج ہیں

طرح سے بنی ہوئی ہیں۔ اور وہ کون لوگ ہیں۔ جن کے اشاروں پر جیلیں "اصلاح گھر" بننے کی بجائے "گمراہ گھر" بنتی جا رہی ہیں۔

پاکستان کی جیلوں میں

- منشیات کا کاروبار ہوتا ہے۔ جیل کے اندر چرس، افیون شراب، ٹنکچر، مارفیاں، پھنوڈین کا استعمال ہوتا ہے۔
- "مقدموں" (سرخ ٹوپی والوں) کے ذریعہ جوا کھلایا جاتا ہے
- سمگلروں اور با اثر افراد کو بی کلاس دی جاتی ہے۔
- رشوت دینے والوں کو ہر قسم کی سہولت دی جاتی ہے۔ رات کے وقت انہیں ان کے گھروں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور صبح سویرے دوبارہ جیل پہنچا دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات موٹی رقم کے عوض ان کی بیویوں کو جیل میں بھی آنے جانے کی کھلی اجازت دے دی جاتی ہے۔
- قیدیوں کے لئے منظور شدہ دوسرے درجہ کا راشن بیچ دیا جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ قیدیوں کو ناقص اور کم غذا سپلائی کی جاتی ہے۔
- سوئی گیس کے چولہوں پر نا مجیتی اور ٹین کے ڈبوں میں کھانا پکایا جاتا ہے۔ نصف قیدی اپنے گھر سے کھانا منگواتے ہیں، جبکہ حکام کا غذات میں پورا کھانا دکھاتے ہیں۔ اس طرح نصف کھانے کی رقم "جیب خاص" میں پہنچ جاتی ہے۔
- رشوت عام ہے۔ رشوت نہ دینے والے قیدیوں سے غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔ انہیں عزیز و اقارب سے ملنے نہیں دیا جاتا۔
- جیل مینول کے برخلاف کچے قیدیوں سے مشقت کا کام لیا جاتا ہے۔
- کچے قیدیوں سے پیشی کے وقت رشوت مانگی جاتی ہے رشوت نہ دینے کی صورت میں ان کی پیشی نہیں لگتی اور وہ سالوں عدالت کی صورت نہیں دیکھ پاتے۔
- قیدیوں سے ملاقات کے لئے عام طور پر رشوت لی جاتی ہے، زیادہ رشوت دینے والوں کو بیرکوں کے اندر تک جانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔
- "کچے اور پکے" قیدیوں سے انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ حیوانوں جیسا سخت گیر برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ان کی انا اور خود داری کچل دی جاتی ہے۔ ان سے باعزت اور باوقار زندگی کا حوصلہ چھین لیا جاتا ہے۔ اور انہیں مختلف جرائم کی تربیت دے کر عادی مجرم بنا دیا جاتا ہے۔
- جیل سے باہر نکلنے کے بعد قیدیوں کے لئے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ انہیں کوئی گلے لگانے کو تیار نہیں ہوتا۔ جیل کے اندر انہیں نفرت اور حقارت ملتی ہے۔ جیل کے باہر بھی انہیں اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جرائم کی دنیا میں لوٹ جاتے ہیں۔
- جیل کے اندر مریض قیدیوں کے علاج و معالجے کی سہولت نہیں دی جاتی۔ بے شمار قیدی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عادی مجرم، رشوت دے کر اسپتال چلے جاتے ہیں۔ اور ہفتوں مہینوں اسپتال میں پڑے رہتے ہیں۔
- گنجائش سے زیادہ قیدی رکھے گئے ہیں۔
- پیشی کے دن عدالتوں میں قیدیوں کو لاتے اور لے جانے کے لئے گاڑیاں کم ہیں۔
- مقدمات کی کارروائی کا سلسلہ طویل ہوتا ہے، بیشمار مقدمات عرصہ دراز سے زیر سماعت ہیں۔ اور بے شمار کچے قیدی سزا کے بغیر جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔
- ہر نئے آنے والے قیدی کی ناڑی (جیل کے ساتھ ایک کوٹھری) میں جامہ تلاشی لی جاتی ہے۔ اس کے پاس نقدی کی صورت میں جو کچھ ہوتا ہے، رکھوا لیا جاتا۔ بعد میں جیل والے اسے آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔
- ۶۸-۱۹۶۷ء میں کراچی جیل کے قیدیوں کے بنائے ہوئے سامان سے تقریباً ایک لاکھ روپے کی سالانہ آمدنی ہوئی تھی، لیکن جیل کی صنعتوں میں کام کرنے والے کسی قیدی کو بھی کو اس آمدنی میں حصہ دار نہیں بنایا گیا۔

آج سے چند سال پیشتر پاکستان کی جیلوں کی اصلاح کے لئے جسٹس ایس اے محمود کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی گئی تھی جس کا کام تمام جیلوں کا معائنہ کر کے رپورٹ پیش کرنا تھا۔ اس رپورٹ کی اشاعت عوامی سطح پر نہیں کی گئی۔ اس زمانے میں ایک نیوز ایجنسی کے رپورٹر نے ان سے انٹرویو کیا تھا۔ جس میں انہوں نے دبی دبی زبان میں جیلوں کے بارے چند تلخ حقائق کا اظہار کیا تھا۔

۱۔ کراچی جیل میں دوسری جیلوں کے مقابلے میں تعداد سے زیادہ قیدی رکھے گئے ہیں۔ جیلوں میں توسیع کئے بغیر اس مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ جیلوں کی تعمیر اور توسیع کے لئے بھاری فنڈ

رشوت دے کر قیدی رات گھر پر بھی گزار سکتے ہیں

چاہیئے۔

۲۔ قیدیوں کی اصلاح کے لئے انہیں تعلیمی اور ٹیکنیکی تعلیم دینی ضروری ہے تاکہ وہ جیل سے نکلنے کے بعد اپنے لئے باعزت روزگار حاصل کرسکیں، ہماری جیلوں میں اس اہم مسئلے پر فی الوقت کم توجہ دی جاتی ہے۔

۴۔ ایک قسم کا فنڈ قائم کیا جائے تاکہ جیل سے نکلنے کے بعد قیدی کو جب تک روزگار نہیں ملتا، اس فنڈ سے اس کی کفالت کی جائے۔ قیدیوں کی مصنوعات سے حاصل ہونے والی آمدنی کے ذریعہ اس فنڈ کو زندہ رکھا جائے

۵۔ قیدیوں کو امداد دینے والی سوسائٹی نے اپنے تمام سے اب تک قیدیوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ چنانچہ ایسی ویلفیئر سوسائٹیاں بنائی جائیں جو درحقیقت قیدیوں کو معاشرے میں باعزت مقام دلانے میں اہم اور نمایاں کام کریں۔

۶ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ جیلوں کے حالات خراب تھے گو اب پہلے جیسی صورت حال نہیں ہے۔ جیلوں کے خراب حالات کی ایک بڑی وجہ جیلوں میں تعداد سے زیادہ قیدیوں کا رکھا جانا ہے۔

۷۔ انہوں نے اس بات پر تنقید کی کہ لاہور اور دوسری جگہوں کی کئی جیلوں کو توڑ دیا گیا۔ اس سے یہ مسئلہ کچھ زیادہ سنگین ہو گیا ہے۔

۸۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ جیلوں کے موجودہ نظام میں قیدیوں کو صرف نظر بند رکھا جاتا ہے، ان کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔

۹ انہوں نے بتایا کہ مقامی قیدیوں کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ان کے مقدمات کے فیصلے میں غیر معمولی تاخیر ہوتی ہے۔

اسی زمانے میں جیلوں کا ایک سروے بھی کیا گیا تھا۔ جس سے مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئے۔

۱۔ کچے قیدیوں کو ٹرانسپورٹ کے لئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی وجہ ٹرانسپورٹ کی کمی بتائی گئی

۲۔ روزانہ ۱۵۰ سے لے کر ۲۰۰ قیدیوں کو سٹی کورٹ لے جانے کے لئے صرف ایک گاڑی جس میں بیک وقت ۵۴ قیدی سفر کرسکتے ہیں۔

۳۔ سٹی کورٹ میں بے شمار مقدمات بہت دنوں سے زیر سماعت ہیں روزانہ کئی مقدمات کی کارروائی محض اس وجہ سے روک دی جاتی ہے کہ پولیس مطلوبہ قیدیوں کو عدالت میں حاضر نہیں کرپاتی۔

۴۔ جیل کے اندر رشوت اور اقربا پروری عام ہے

۵۔ جیل کے اندر چرس، افیون، اور جوئے کا کاروبار ہوتا ہے۔

جسٹس ایس اے محمود کی سربراہی میں جیل اصلاحی کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر نہیں لائی گئی۔ ممکن ہے اس رپورٹ میں کچھ ایسی باتوں کا انکشاف کیا گیا ہو جس سے جیل حکام کی بے پردگی کا خوف لاحق ہو پھر بھی اس رپورٹ میں جیل کی اصلاح کے لئے کچھ نئی تجاویز اور سفارشات بھی پیش کی گئی ہوں گی شاید ان پر عمل درآمد کی نوبت نہیں پہنچی۔ اگر ان تجاویز پر عمل کیا جاتا تو شاید آج ہمارے یہاں کی جیلوں کے حالات اس قدر بدتر نہ ہوتے اور نہ ہی آئے دن ایسے خونی ہنگامے ہوتے۔

سزا کے طریقے

ہمارے یہاں قیدیوں کی اصلاح نہیں کی جاتی بلکہ ان کے ساتھ جس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے اس سے وہ عادی مجرم بن جاتے ہیں۔ ہماری جیلوں کا صرف ایک مقصد ہے کہ مجرموں کو پکڑ کر بند کر دیا جائے اور ان پر انسانیت سوز سزا کا تجربہ کیا جائے۔ سزا کا یہ طریقہ ظالم اور جابر رومیوں کے طریقہ کار سے ملتا جلتا ہے اس طریقہ کار میں انتقامی نظریہ کار فرما ہے یعنی، اگر کوئی شخص قتل کرے تو اسے قتل کر دیا جائے اگر چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ لئے جائیں۔ روم کا ایک بااثر اور محدود طبقہ اپنے غلاموں سے اسی قسم کا سلوک کرتا تھا۔ اور معمولی خطا پر غلاموں کو ایسی کڑی سزا دی جاتی تھی کہ آج بھی ان کے حالات پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ ایک انتہائی دقیانوسی طریقہ ہے اس میں مجرموں کی اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس طریقہ کار کے خلاف آواز بلند ہوتی۔ اور کہا گیا "چونکہ ریاست زندگی نہیں دے سکتی، اس لئے اسے کسی کی زندگی لینے کا اختیار بھی نہیں ہے۔" پھر اس طریقہ کار میں سب سے ظالمانہ پہلو یہ ہے کہ جرم کرنے والے شخص کی سزا سے اس کے متعلقین بھی معاشی طور پر متاثر ہوتے ہیں یعنی اگر الف۔ ب کو قتل کرتا ہے تو ب کو پھانسی کی سزا دے دی جاتی ہے مگر بات یہی ختم نہیں ہوتی۔ ب کی موت کے ساتھ ہی اس کی بیوی اور بچے جن کی کفالت کی ذمہ داری ب پر تھی۔ ب کی موت کے بعد بے سہارا ہو جاتے ہیں اور در در کی ٹھوکریں کھانے لگتے ہیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ب کو دی جانے والی سزا میں ب کی معصوم اور بے گناہ بیوی اور بچے بھی خواہ مخواہ شریک کر لئے جاتے ہیں ایک شخص کی موت معاشی طور پر ایک پورے کنبے کی موت بن جاتی ہے۔ اس سائنسی دور میں ہمارے یہاں ابھی تک اس فضول بے رحم اور دقیانوسی طریقے پر عمل کیا جاتا ہے۔

پبلک سزائیں

جرائم کی روک تھام کے لئے بعض ممالک میں ابھی تک اس طریقہ پر عمل کیا جاتا ہے یا سزا دینے کے بعد عوامی سطح پر اس کی تشہیر کی جاتی ہے۔ اس قسم کی سزاؤں کا مقصد عوام میں خوف و ہراس پیدا کر کے عوام کے دلوں میں قانون کا احترام پیدا کرنا ہے۔ مگر صدیوں کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ یہ طریقہ کار بھی بے اثر اور غیر انسانی ہے کسی زمانے میں برطانیہ میں جیب کترنے کی وبا عام ہو گئی تھی۔ اس جرم کی بیخ کنی کے لئے جیب کتروں کی سزا موت تجویز کی گئی۔ مگر اس سے جرم میں کمی کا رجحان پیدا نہ ہوا، بلکہ جس جگہ جیب کترے کو پھانسی دی جاتی تھی، اس جگہ سینکڑوں افراد کی جیبیں کٹ جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ مجرموں کو برسرعام سزا دینے سے دیکھنے والوں کے دلوں میں ان کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ سانحہ ائرپورٹ کے مجرم فیروز عبداللہ کا واقعہ، اس کی تازہ مثال ہے اسے کسی پبلک مقام پر تو سزا نہیں دی گئی مگر اخبارات میں اس کی سزا کی جس طرح تشہیر کی گئی اس سے لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے رحم اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہونا ایک لازمی امر بن گیا۔ حالانکہ اس نے اتنا بھیانک جرم کیا تھا کہ اس کے مقابلے میں موت کی سزا بھی ہلکی نظر آتی ہے۔ اس فرسودہ طریقے سے عوام کے دلوں میں قانون کا احترام پیدا کرنا ایک غلط نظریہ ہے اس سے نہ مجرموں کی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں



بازگشت

شبِ ۱۳ر نومبر

شب ۱۳ر نومبر کی شبِ مرگِ وفا ہے
دم مقتلِ زنداں میں کوئی توڑ چکا ہے!

خوں روئے گا اب کون تمنائے سحر کو؟
اس طرح تو پتھر نہیں کرتے ہیں نظر کو!

تاریک خلاؤں میں نظر دیکھ رہی ہے
بے نور ہوئی آنکھ، مگر دیکھ رہی ہے!

اُکتا کے خموشی سے زباں کھول اُٹھیں گے
لب وا ہیں، کہ جیسے ابھی کچھ بول اُٹھیں گے!

پیشانی پہ چوٹوں کے جو نیلے سے نشاں ہیں،
اس ملک کی تہذیب پہ وہ مرثیہ خواں ہیں!

چہرے پہ تبسم کی جو ہلکی سی کرن ہے
اس قوم کے معیارِ عدالت کا کفن ہے!

حلقوم پہ کستی ہوئی اس گرہ کی سوگند،
ہوتا ہی نہیں نور اندھیرے پہ رضامند!

اے سرخیِ خونِ شہدا! یاد رکھیں گے
ساتھی! تجھے ہم لوگ سدا یاد رکھیں گے!

واللہ تجھے کھو کے یہ محسوس ہوا ہے
خورشید۔ کہ اُبھرا بھی نہ تھا ڈوب گیا ہے!

تو مر کے بھی زندہ ہے، سدا زندہ رہے گا
پائندہ تھا، تابندہ ہے، رخشندہ رہے گا!

تہذیب و ترقی کی روایات صدا سے
پہنچی ہیں زمانے میں فقط خون و وفا سے!

اک مردہ و بے فیض تمدن کو بچانے
عیسیٰ کو کوئی مصلوب کیا اہلِ جفا نے!

سُقراط کو پھر زہر دیا کم نظروں نے
منصور کو پھر مار دیا حیلہ گروں نے!

پھر تیرگیِ شب کی کمر ٹوٹ رہی ہے
لاہور کے محبس سے کرن پھوٹ رہی ہے!

خاموش ہیں کہنے کو، مگر بول رہے ہیں
دیوار صدا دیتی ہے، در بول رہے ہیں!

ہر سقف سے، ہر بام سے آواز اُٹھی ہے
اِس قتل گہِ عام سے آواز اُٹھی ہے!

مہکے گی انہی سُرخ گلابوں سے سحر اور
ہاں شرط مگر یہ ہے کہ کچھ خونِ جگر اور!

کچھ ظلم رسیدوں کا لہو اور رفیقو!
دو چار شہیدوں کا لہو اور رفیقو!

ماحول کی قدریں تو سنورتی ہی رہیں گی
ہر دور میں نکھری ہیں، نکھرتی ہی رہیں گی





حسن ناصر

”پرچی جمہوریت“ پر یقین نہیں رکھتے تھے

یہ مضمون پچھلے سال کامریڈ حسن ناصر شہید کی دسویں برسی کے موقع پر پشاور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ”صنوبر“ کی ۱۲ نومبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں چھپ چکا ہے۔ یہ لوگ جاگیردارانہ جبریت کا شکار غالباً اسی لئے ہوئے ہیں کہ انہوں نے کامریڈ حسن ناصر شہید کے مشن کو آگے بڑھانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ آج ان کا جرم یہ ہے کہ ہشت نگر کے کسانوں نے خوانین سرحد کے دہشتناک ماحول کو توڑ کر اپنی صدیوں سے جھکی ہوئی گردنوں کو سیدھا کیا ہے۔ واضح رہے کہ ہشت نگر کے کسانوں کو اس جرم کی پاداش میں ۳ جولائی ۱۹۷۱ء کو عظیم قتل عام برداشت کرنا پڑا ——— (ادارہ)

ابو نصر

کامریڈ حسن ناصر کو شہید ہوئے دس سال گذر گئے ہیں، ۱۳ نومبر ۱۹۶۰ء کو جب انہوں نے پنجاب پولیس کی حراست میں جام شہادت نوش کیا۔ تو ان کی عمر ۳۱ سال کے لگ بھگ تھی۔ میں اس وقت ان سے آٹھ سال بڑا تھا۔ آج میں حسن ناصر سے اٹھارہ سال بڑا ہوں۔ بال سفید ہو گئے۔ بڑھاپے کے آثار نمایاں ہیں۔ لیکن حسن ناصر شہید جوان ہے۔ ہمیشہ جوان رہے گا۔ آج کی اور آنے والی نسلوں کے قافلہ آزادی کی رہنمائی کرتا رہے گا اور ان کو اس تاریخی عمل کی تکمیل کے لئے بڑھاوا دیتا رہے گا جس میں پاکستان کے دکھیارے محنت کشوں کی نجات مضمر ہے

۱۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو پشاور میں مزدور کسان پارٹی کے زیر اہتمام غریب کسانوں اور کھیت مزدوروں کا ایک عظیم الشان جلوس نکلا۔ جاننے والوں کا کہنا ہے کہ پشاور کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ سب سے بڑا جلوس تھا۔ اس جلوس میں پشتون نوجوانوں نے جلوس کے آگے حسن ناصر کی تصویر اٹھائی ہوئی تھی۔ سارے جلوس میں کسی دوسرے زندہ یا مرحوم پاکستانی کی تصویر نہیں تھی۔ پشتون نوجوانوں نے اپنے شہید بھائی حسن ناصر کو خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ عقیدت مندی کا سلسلہ کہاں سے کہاں جا ملا حیدر آباد دکن، کراچی، لاہور، پشاور اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن ناصر اس بین الاقوامی جذبے کا پاکیزہ ترین مظہر ہے جو کہ آج کی دنیا کی خصوصیت ہے اور کل کی امید۔

شہید کا خون لے لو — ووٹ دے دو

حسن ناصر شہید اس زمانے میں ہم سے بچھڑ گئے جب عالمی پرولتاری تحریک ابھی تک بہت بڑی تقسیم و تفریق اور بڑے پیمانے کی تنظیم نو کے تقاضوں سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اس فارو قیت کی لہروں نے ابھی تک پاکستان کی ترقی پسند تحریک کو متاثر نہیں کیا تھا چنانچہ پچھلے دس سالوں میں ہر نوع کے ”ترقی پسند“ نے حسن ناصر کی یاد کو اپنا علم بنایا ہے اور اس کی شہرت کو جبہ و عمامہ بنا کر زیب تن کیا ہے کہ شاید اسی ذریعے وہ قبول عام پا سکے۔ کئی ذاکروں نے اپنی ذہنی فرسودگی پر ”حسن ناصر کے خیالات“ کا عنوان چسپاں کر دیا ہے اور فرما دیا ہے کہ حسن ناصر اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ”شہری آزادیاں، جمہوریت پریس اور اخبارات کی آزادی ملک کے مفلوک الحال طبقے کو منظم کرنے میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ ہمیشہ شہری آزادیوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ بغیر اس کے کسان اور مزدور اپنا کوئی حق حاصل نہ کر سکیں گے۔ اور نہ اس کے بغیر مزدوروں کی حکومت قائم ہو سکے گی“۔ گویا حسن ناصر شہید حیدر آباد دکن کے ریڈ ہل کے متمول علاقے کے ایک بنگلے سے نقل مکانی کر کے کراچی کے مزدوروں کے احاطے میں، ایک کھنڈر میں اس لئے آباد ہوئے تھے کہ کسی صاحب تن نوش کے لئے مزدور ووٹوں کا بندوبست کر سکیں اور ”پرچی جمہوریت“ پر اپنی جان قربان کر دیں۔ مقام شکر ہے کہ حسن ناصر اپنی شہادت سے ایک سال پیشتر یعنی ۱۹۵۹ء کی اپنی ایک تحریر چھوڑ گئے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا ہے

کہ سامراج اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مختلف طریقے اپناتا ہے، یہ پارلیمانی جمہوریت کے ذریعے بھی کام کر سکتا ہے۔ اور آمریت کی انتہائی برہنہ شکل کے ذریعے بھی۔ اور اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ کسی مخصوص وقت میں کونسا طرز حکومت اس کے مفادات پر پورا اترتا ہے اور کس سے اسے بہترین نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ سامراج ان دو میں سے کسی ایک طرز حکومت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ترقی دیتا ہے۔ جہاں کہیں بھی اس کے مفادات تقاضا کریں۔ خواہ کتنے ہی وقتی طور پر کیوں نہ سہی تو وہاں سامراج جمہوریت کے معمولی آثار تک تباہ کرنے میں رتی برابر تکلف سے کام نہیں لیتا اور اس سلسلہ عمل کے دوران اپنے قریب ترین حمایتیوں کو دغا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا“ یہ اس وقت کی تحریر ہے جب مارشل لاء جوبن پر تھا۔ اور قوم فوجی بوٹ کے نیچے کراہ رہی تھی۔ لیکن حسن ناصر نے شہری آزادیوں کی اشد ضرورت کے باوجود پارلیمانی جمہوریت کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کی، ”بزرگواروں“ کا ایک اور سیٹ ہے جو ”پرچی جمہوریت“ پر جان چھڑکتا ہے بلکہ اس کے بغیر جاں بلب ہے۔ حال ہی میں جب انتخابات کو دو مہینے کے لئے ملتوی کر دیا گیا تو یہ حضرات بلبلا ہی تو اٹھے، ملاحظہ ہو ان کی نوحہ گری۔

”ہم تشنہ لبان پاکستان ۲۳ سال سے جمہوریت کی دو بوندوں کو ترس رہے ہیں۔ ہمارے ہونٹوں کی تشنگی سے راوی اور بدھا میں طلاطم برپا ہے اور ایوان اقتدار کے در و بام لرزاں ہیں لیکن قدرت کی ستم ظریفیاں ہنوز ہمارے صبر و تحمل کا امتحان لینے پر تلی ہوئی ہیں، مے خانے میں خم کی قطاریں لگی ہیں، صراحیاں رقص کر رہی ہیں اور پیمانے گردش میں ہیں، مگر وہ نشہ نہیں

کچھ لوگوں نے اُس کی شہادت کو جُبّہ و عمامہ بنا کر زیبِ تن کر لیا ہے

آئی جس سے دل کی آگ بجھے اور آرزو کی بے قراریوں کو قرار آئے، بادل گھر کر آتے ہیں، بہار کا سماں بندھتا ہے۔ لیکن ابھی پیاسوں کے لب بھیگنے نہیں پاتے کہ محفل درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اور مے خانہ ماتم خانہ بن جاتا ہے سیل رواں کے تھپیڑے امیدوں پر پانی پھیر دیتے ہیں اور پھر وہی تشنہ لبی پھر وہی شبنم کی التجا۔ پھر وہی التجا کی گھڑیاں، طویل، تیز و تار۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات دسمبر تک ملتوی کر دیئے گئے ہیں۔ . . . . . .

(لیل و نہار شمارہ نمبر ۲۷، ۱۳ اگست ۱۹۷۰ء)

لاحول ولا قوۃ کیا ناٹک رچایا ہے جب اس قسم کے بے جان شکست مست ہاتھ حسن ناصر کی یاد کو اپنی جھولی میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو دل کو فت ہوتی ہے۔ کہاں حسن ناصر کا سا شعلہ جوالا اور کہاں انقلابی بھٹی کی یہ بجھی ہوئی تلچھٹ (ع ہ ی)

وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے
وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے

شہید حسن ناصر جیسا ارادہ کا پکا نوجوان مجھے بہت کم ملا ہے۔ خیال کیجئے۔ نوجوانی میں وہ گھر بار چھوڑ کر بمبئی آجاتا ہے اور انقلاب کی جدوجہد میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے عمر کی بیس بہاریں نہیں دیکھتا کہ گھر سے سینکڑوں میل دور کراچی کی متعفن مزدور بستی میں ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کو اپنا مسکن بنا لیتا ہے۔ گھر کیا تھا مزدوروں کے احاطے میں ایک کھنڈر تھا۔ جس کے دو کمرے ابھی تک سلامت تھے۔ ان میں بان کی تین چار چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک ٹوٹی سی میز تھی، جس کے پائے اینٹوں کے سہارے کھڑے تھے۔ دو مونڈھے تھے۔ اور ایک لالٹین۔ نہ پانی کا نل تھا نہ بجلی۔" کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ نظام دکن کے ایک جائنٹ سیکرٹری سید علمبردار حسین کا بیٹا۔ نواب محسن الملک کا پرنواسہ ناز و نعیم میں پلا ہوا گداز بورژوا بانہوں کے حلقے، مشکبار زلفوں کے پیچ، رنگ و بو کا طوفان، عنبر دستوں کی جلوہ گری، زرنگار زندگی کی بہاریں، مہکتا ہوا ماحول، حسیناؤں کے چہکتے ہوئے غول، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مزدوروں کی برادری میں شامل ہو گیا تھا۔ استحصال کے عطر بیز فواروں سے بھاگ کر اس نے محنت کے پسینے کے قطروں کو پسند کر لیا تھا۔ جس نظام نے اس کی پرورش کی تھی۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے کمربستہ ہو گیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا انقلابی پہلی دفعہ ظاہر نہیں ہوا تھا۔ موسیٰ نے فرعون کے گھر میں پرورش پائی تھی اور اس وقت کے گلے سڑے معاشرے کی ابتریوں سے واقف ہو کر اس سے باغی ہو گیا تھا۔ عیسیٰ یہودی پیدا ہوا اور یہودیوں کے ایسے درپے ہوا کہ ان کے ہاتھوں سولی تک نوبت پہنچ گئی محمد عربی کعبے کے متولیوں کے ہاں پیدا ہوا اور ان کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہونے والوں کی حمایت میں طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں، رات کی تاریکی میں ہجرت کی بالآخر نوبت جدال و قتال تک پہنچ گئی۔ کارل مارکس نے بورژوا یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی، بورژوا معیشت اور فلسفے کی روح کو سمجھ کر "سرمایہ" کے نام سے اپنی شہرہ آفاق کتاب میں سرمایہ داری کو ننگا کیا۔ ایک نوابزادی سے شادی کی اور دونوں سوشلزم کو پھیلانے اور مزدوروں کو انقلاب کے لئے منظم کرنے میں منہمک ہو گئے اور یورپ کی کئی سلطنتوں کی پولیس کے کتوں سے جان چھڑانے کے لئے ساری عمر دربدر رہے۔

حسن ناصر نے بہت چھوٹی عمر میں کمیونسٹ پارٹی میں اونچا مقام پا لیا۔ پارٹی کے مرکزی سیکرٹریٹ کے رکن بنے اور سندھ پارٹی کمیٹی کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے انہوں نے زندگی کی تمام آسائشوں کو ٹھکرا کر اپنے آپ کو مزدور طبقے میں پورے طور پر ضم کر لیا تھا۔ مزدور طبقے سے حسن ناصر کا زندگی کے آخری لمحے تک ایک اٹوٹ رشتہ قائم رہا۔ ۱۹۵۱ء میں کمیونسٹ پارٹی راولپنڈی سازش کیس کا شکار ہو گئی۔ پولیس تشدد کے جہنم کے دروازے کھل گئے جو کوئی بھی قانون اور انتظام کے نگہبانوں کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ اس میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ حسن ناصر بھی گرفتار ہوئے وہ روپوش ہو گئے تھے۔ لیکن پارٹی کی بلندیوں میں غداری کا زہر نمودار ہو گیا تھا اور وہ پکڑ لئے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں ان کو پوچھ گچھ کے لئے لاہور کے شاہی قلعہ میں لایا گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۴ سال تھی۔ آٹھ سال کے بعد انہوں نے اسی جہنم میں اپنی جان سے ہاتھ دھوئے تھے۔

گودڑی میں لعل

ابتلا کے پہلے ہی جھٹکے نے پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا تیا پانچہ کر دیا۔ اس کے سیکرٹری جنرل سید سجاد ظہیر راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ہو کر جیل پہنچ گئے۔ بے شمار دوسرے کارکن سیفٹی اور سیکیورٹی کے کالے قوانین کی زد میں آگئے اور جیل میں ٹھونس دیئے گئے۔ نوکریوں سے نکالے گئے۔ ان کے خاندان کو ہراساں کیا گیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ لیکن اتنے ہی میں اس انقلابی پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا۔ ۱۹۵۴ء میں گورنمنٹ نے کرم فرمایا اور اس پر پابندی لگا کر اس کا بھرم رکھ لیا۔

بنے بھائی (سید سجاد ظہیر) کا اپنا رہن سہن بھی انگلستان اور ہندوستان کے اونچے طبقوں کے رہن سہن کا امتزاج تھا یا ہے۔ وہ انسانی اختراع کی بہترین تخلیقات سے رغبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے مزدور ساتھیوں کی کاریگری کی برکتیں ہیں آپ صاحب طرز ادیب اور اونچے پائے کے نقاد ہیں۔ ایک ثقہ راوی کا بیان ہے کہ جیل میں ان کے ساتھیوں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ وہاں ان کے درس کا سلسلہ بہت وسیع تھا قرآن، حدیث، مثنوی روم، فتوح الغیب، کشف المحجوب، انگریزی، اردو، فارسی، ہندی، فرانسیسی، مارکسزم کیا کچھ نہیں تھا جس میں ان کے شاگرد موجود نہ تھے۔ ایسا شفیق، کھلی پیشانی والا استاد دوسرا نہیں ہو سکتا۔ کتابوں سے ان کو انتہائی محبت ہے یہی محبت ان کی گرفتاری کا موجب ہوئی۔

الناس علیٰ دین ملوکہم، مولانا نے اپنے ارد گرد قریبی حلقے میں جن لوگوں کو اکٹھا کیا ان میں ظاہر ہے کہ اکثریت انہی جیسوں کی تھی۔ یہ حضرات مجاز کے الفاظ میں "محلات میں رہ کر جھونپڑیوں کے خواب دیکھنے والے صاحب دل تھے۔ فیض کی اس زمانے کی مشہور نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" ان لوگوں کے فلسفے کے ایک بڑا اچھا اظہار ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے، ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے!
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے!

درد و جذب وفور ہے۔ سینے میں آگ ابلتی ہے، غریبوں کی حمایت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ لیکن ایک اور جذبہ بھی اس کے متوازی ساتھ ساتھ موجود ہے۔ اس بات پر جھنجھلاہٹ کہ حسن دل کش کا لطف اٹھاتے وقت غریبوں کا وجود رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے، غلاظتوں کے بیچوں بیچ عشق و مستی کا لطف ہی کیا۔ لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے، اوپر سے نیچے اترتی ہوئی مجبور نظر۔ درمیان میں محفوظ فاصلہ امراض ناسوروں اور پیپ سے حفاظت کے لئے: بیچوں بیچ حفظان صحت کا قلعہ (CORDR SANITDISE) نظر کے ذریعے جراثیم نہیں آتے صرف طبیعت

الفتح

"سامراج پارلیمانی جمہوریت اور آمریت کی برہنہ شکل میں اپنے کام نکالتا ہے" (حسن ناصر)

منعقد ہوتی ہے۔

تنظیم کے بندھن ٹوٹے تو ہر کوئی اپنی اصل کی طرف لوٹ گیا۔ جاگیرداری مردہ باد پکار پکار کر بے حال ہو جانے والے جاگیردار بن گئے۔ اجارہ دار سرمایہ داری مردہ باد پکارنے والے اجارہ دار سرمایہ داروں کے پورٹ روموں میں براجمان ہو گئے۔ افسر شاہی مردہ باد کا ورد کرنے والے بڑے بڑے افسروں کے ہم نوالہ و ہم پیالہ بن گئے۔ کانونٹ اسکول، بنگلہ، بیگم، کار، کامیابی، سوشلزم بجھوئی، آسودہ خاطری، بزدلی، مکر و فریب، منافقت۔

پارٹی کے اوپر کے حلقے میں حسن ناصر یکہ و تنہا رہ گیا۔ اس نے مزدوروں میں اپنا مسکن بنایا تھا۔ وہ ان کے درمیان بستا رہا۔ پارٹی کے اوپر کے حلقے والوں کی نگاہوں سے وہ ۱۹۵۲ء میں ہی اوجھل ہو گیا تھا۔ ہمیشہ کے لئے وہ حسن ناصر کو پھر کبھی نہ دیکھ سکے اس کی مبینہ لاش کو بھی دیکھنے نہ آئے۔ ان لوگوں کے برعکس حسن ناصر نے اپنی نظریں اس انقلاب سے کبھی نہ اٹھائیں جس کا نقشہ سوا سو سال پہلے کارل مارکس کھینچ گیا ہے۔

بورژوازی نے محض وہ ہتھیار ہی نہیں ڈھالے جو اس کی موت کو قریب لا رہے ہیں۔ بلکہ وہ تو ان لوگوں (پرولتاری طبقہ) کو بھی وجود میں لے آیا ہے۔ جو یہ ہتھیار اُٹھائیں گے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ صنعت کی نشوونما کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ صرف تعداد میں نہیں بڑھتا بلکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں مرکوز ہونے لگتا ہے۔ اس کی طاقت بڑھتی جاتی ہے اور وہ اپنی طاقت کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے جیسے جیسے مشین محنت کے تمام امتیازات کو مٹاتی جاتی ہے اور تقریباً ہر جگہ اجرتوں کو ایک ہی پست سطح پر گرائی جاتی ہے۔ اسی نسبت سے پرولتاریہ کی صفوں کے اندر مختلف مفادات اور زندگی کے مختلف حالات میں یکسانیت پیدا ہوتی رہتی ہے بورژوازی کے مابین بڑھتی ہوئی مسابقت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے تجارتی بحران، مزدوروں کی اجرتوں میں زیادہ سے زیادہ چڑھاؤ پیدا کرتے رہتے ہیں، مشینوں کی نت نئی اصلاح اور تیز تر ترقی کی وجہ سے مزدوروں کی روزی زیادہ سے زیادہ جوکھم میں پڑتی جاتی ہے۔ مزدوروں اور بورژوازی کی انفرادی جھڑپیں روز بروز دو طبقوں کے ٹکراؤ کی نوعیت اختیار کرتی جاتی ہیں۔ ان حالات کی وجہ سے مزدور بورژوازی کے خلاف اپنی تنظیمیں بنانا شروع کر دیتے ہیں اجرت کی شرح کو قائم رکھنے کے لئے وہ باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں اپنی وقتی بغاوتوں کے لئے پہلے سے بندوبست کئے رکھنے کی غرض سے وہ مستقل انجمنیں قائم کر لیتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ مقابلہ بلوے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔۔۔۔۔ پرولتاریہ کی نشوونما کے سب سے زیادہ عمومی مدارج بیان کرتے ہوئے ہم نے اس خانہ جنگی کا پتہ لگایا تھا۔ جو موجودہ سماج میں کسی نہ کسی حد تک پوشیدہ طور پر زور و شور سے جاری ہے حتیٰ کہ وہ منزل آجاتی ہے جہاں یہ جنگ برملا انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور جہاں بورژوازی کا تختہ زبردستی الٹ کر پرولتاریہ کے اقتدار کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔۔۔۔۔"

اس انقلابی طبقے کے ساتھ حسن ناصر کے تعلقات کیسے تھے؟ کیا وہ ان کی طرف لوٹتی ہوئی رحم بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔ ہرگز نہیں، ایسی ٹٹ پونجی نگاہ کرم کو پرولتاریہ کب برداشت کرتا ہے۔ وہ تو ان ٹٹ پونجیے بابوؤں کا نجات دہندہ

وہ ہمیشہ

آنے والی نسلوں کی

رہنمائی کرتا رہے گا

ان کے مالکوں سے ٹکر لے کر ان کے اقتدار کو پاش پاش کرنے والا، دنیا کے تمام مظلوموں کا ہادی و مرشد ہے۔

دنیا کے بے شمار انقلابیوں نے کارل مارکس کے آدرش پر لبیک کہی اور ایک کٹھن اور پیچیدہ جدوجہد میں زندگی کی بازی لگا دی۔ بہت سے اس جدوجہد میں سرخرو ہوئے۔ لینن، سٹالن، ماؤزے تنگ، انور ہوجا، ہوچی منہ، کم ال سنگ، فیڈل کاسترو اور دوسرے بے شمار انقلابیوں نے کامیابی کے ساتھ اپنی اپنی قوموں میں محنت کشوں کا اقتدار قائم کیا۔ لاکھوں جیالے اس کارزار میں کھیت رہے۔ ان میں حسن ناصر بھی شامل ہے۔ وہ اپنے کردار کی ایک شمع فروزاں چھوڑ گیا ہے۔ جو بیشمار پاکستانی نوجوانوں کے دلوں کو منور کر رہی ہے۔ اور کرتی رہے گی اور ان کو انقلاب کی تکمیل کے لئے بڑھاوا دیتی رہے گی۔

آؤ سارے مل کر ہم ایک سنگھم کے گن گائیں
آؤ سارے راہی مل کر ایک ڈگر پر جائیں!
آؤ سارے سنگی ساتھی پریت کی سیج سجائیں
اک دوجے کا دکھ سکھ بانٹیں دیپ سے دیپ جلائیں

(ملک بدری)

شاہی قلعہ لاہور کے پولیس گرگوں نے یقیناً اندازہ لگا لیا ہوگا۔ کہ حسن ناصر نہ تو کسی خوف و خطر کی وجہ سے اپنی پسندیدہ راہ کو چھوڑے گا۔ اور نہ ہی کسی قسم کے جھانسے میں آئے گا۔ "شریف اور سمجھ دار" انقلابیوں کو اس گریبان چاک کے اثر سے بچانے کے لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ حسن ناصر کو پاکستان بدر کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں ان کو ایک سال کے لئے پاکستان سے نکل جانے کا حکم دیا وہ واپس ہندوستان چلے گئے اور حیدر آباد دکن میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے جا ملے۔

حسن ناصر کی والدہ صاحبہ (ان کی یاد آتے ہی مجھے امام حسین کی بہن بی بی زینب یاد آ جاتی ہیں، جنہیں بھائی کے نیزے پر ٹنگے ہوئے سر کے جلوس کے ساتھ کوفہ اور دمشق کی گلیوں میں پھرایا گیا۔ لیکن جنہوں نے خانوادہ رسول کی آن کا پرچم جھکنے نہ دیا) نے مجھے بتایا کہ ان کے خاندان والے نہیں چاہتے تھے کہ حسن ناصر واپس پاکستان جائے چنانچہ ان کی دلچسپی کے وہ تمام سامان پیدا کئے گئے جو ایک امیر خاندان والے کر سکتے ہیں۔ حسن ناصر اس وقت پچیس چھبیس سال کے خوبرو جوان تھے۔ شادی خانہ آبادی کے لئے نہایت موزوں، لیکن انہوں نے تمام ترغیبوں سے منہ موڑ لیا۔ ان کا دل کراچی کی مزدور بستی میں واپس پہنچنے کے لئے بیتاب تھا۔ جب دوسری تمام ترکیبیں ناکام رہیں تو گھر میں سے کسی نے بھارت کی کمیونسٹ پارٹی کی امداد چاہی اس پارٹی نے بھی حسن ناصر کو بھارت میں رُک جانے کے لئے کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ ماں نے بیٹے کو پریشان دیکھا تو ایک ماں کی طرح اس کی مدد کو پہنچ گئی۔ اس کو آشیرباد دی، چوما چاٹا اور خوشی خوشی گھر سے روانہ کر دیا۔ حسن ناصر کی والدہ صاحبہ نے مجھ سے کہا حسن ناصر میری مرضی کے خلاف آیا تھا۔ لیکن میں چاہتی تھی کہ میرا بیٹا اپنے مشن میں کامیاب ہو کیونکہ یہی اس کی رضا تھی۔ میں خود تو یہی چاہتی تھی کہ وہ میرے پاس رہتا۔

چار سال کے بعد یہ ماں تنہا سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے ایک اجنبی شہر میں آئی تاکہ اپنے پیارے بیٹے کی لاش واپس لے جائے۔ لیکن اس کی یہ مراد پوری نہ ہوئی۔ اب وہ لاہور کی خلاؤں کی طرف گھورتی رہتی ہو گی۔ شاید ان کی ڈھارس اس حقیقت سے کچھ حد تک بندھتی ہے کہ پاکستان کے بیشمار نوجوان ناصر کے غم کو ناقابل شکست عزم میں بدل رہے ہیں۔





لہُو کی خوشبُو

حسن ناصر کی برسی پر

چمن چمن میں ، دمن دمن میں
تیرے مقدّس لہُو کی خوشبو رچی ہُوئی ہے
لہو کہ جو سُرخیٔ وفا ہے
لہو جو بیداریٔ انا کے لیے بہا ہے
لہو جو بہہ کر جنوں کا پیغام بن چُکا ہے
لہو جو طوفان اُٹھا رہا ہے
لہو جو سُورج اُگا رہا ہے

لہو کہ جس کا ہر ایک قطرہ
شب سیہ میں ضیا کا مینار بن گیا ہے
وفا کا شہکار بن گیا ہے
یہ وہ مقدّس لہو ہے جس سے
خزاں زدہ گلستاں کو تازہ لہو مِلا ہے

فارغ بخاری

حسن ناصر شہید

قاتل کے گن گانے والا اس کا سوگ منائے کیوں؟
رہزن سے مل جانے والا راہنما کہلائے کیوں؟
سچ کا خُون بہانے والا ہم لوگوں میں آئے کیوں؟
ہم ہیں حسن ناصر کے ساتھی ٹھیک ہمارا رستہ ہے
جو ہم دل والوں سے اُلجھے، جاہ طلب ہے جھُوٹا ہے

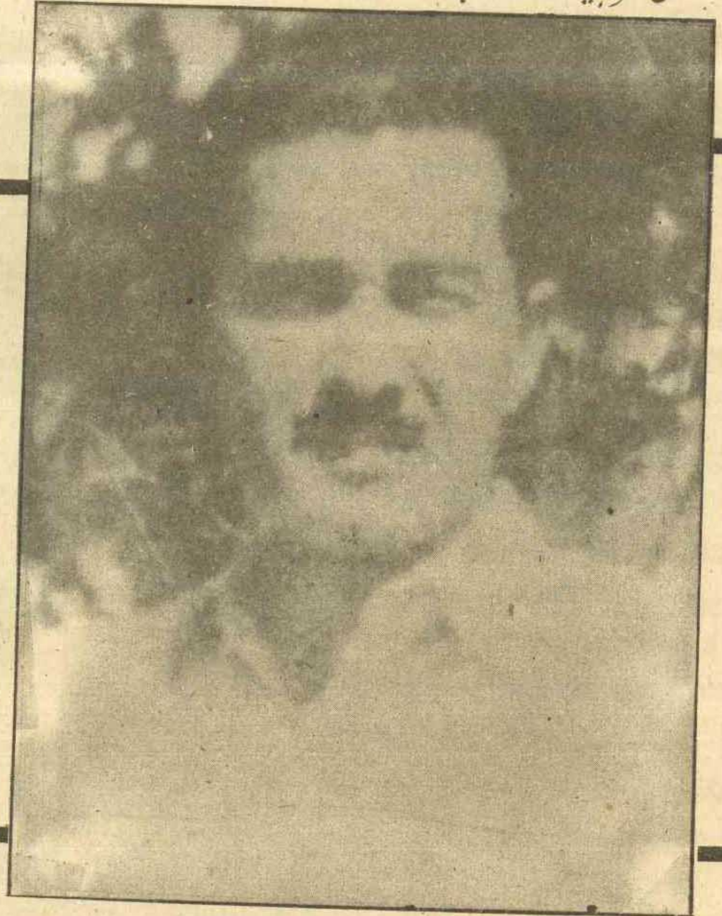
●

جھونپڑیوں سے ہم اُٹھے ہیں، محلوں پر چھا جائیں گے
زرداروں کا نام مٹا کر راج عوامی لائیں گے
مزدوروں کا سُرخ پھریرا ہم اُونچا لہرائیں گے
خُونِ حسن ناصر کا بدلہ لیں گے اِک اِک قاتل سے
دُور نہیں کر سکتا کوئی ہم کو اپنی منزل سے

حبیب جالب

ایوبی انقلاب کو "انقلاب" نہ کہنے پر
قلعہ لاہور میں خون کی ہولی کھیلی گئی

مزدور کسان پارٹی کے صدر ریٹائرڈ میجر اسحاق محمدؔ، شہید حسن ناصر پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ ذیل کا مضمون اِس کتاب کے چند اوراق پر مشتمل ہے۔ مذکورہ کتاب جناب اسحاق محمدؔ کی رہائی کے بعد شائع ہو سکے گی۔ اس میں مقدمے کی مکمّل کارروائی اور تفصیلات درج ہیں۔ اس کی اشاعت کے حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں۔ ادارہ ذیل کے اوراق کی اشاعت کے لیے مرتب کا شکر گزار ہے



پولیس نے حسن ناصر شہید کی بجائے کوئی اور مُردہ پیش کر دیا

استعماریت اور ملوکیت کا نشان — قلعہ لاہور سینہ تانے کھڑا ہے۔ اس کی بنیادوں میں نہ جانے کتنے محنت کشوں کا پسینہ دفن ہے۔ وہ پسینہ جو خالق ہے۔ لیکن ایک شہنشاہ نے دمڑیوں کے مول اسے خرید کر قلعہ لاہور کی خالق کی حیثیت سے اپنا نام تاریخ میں محفوظ کر لیا۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ دنیا ایک شہنشاہ کو قلعہ لاہور کا خالق سمجھتی ہے اور اس کے حقیقی خالقوں پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہے کہ اب یہ قلعہ مزدوروں اور کسانوں کا مقتل بن چکا ہے۔ ایک اذیت خانہ بن گیا، مزدوروں اور کسانوں کے رہنماؤں کے جسم دار پر کھنچتے ہیں اگر قلعہ لاہور کے خالقوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں یہ قلعہ ان ہی کے طبقے کے لئے قتل گاہ بن جائے گا۔ تو وہ اپنی ہی تخلیق کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کر دیتے۔

پاکستان کے مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کے عظیم انقلابی رہنما حسن ناصر ۱۳ نومبر ۱۹۶۰ء کو قلعہ لاہور میں شہید کر دیئے گئے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مارشل لاء نافذ تھا۔ ایوبی آمریت برہنہ رقص کر رہی تھی، رات کو رات کہنا جرم تھا۔ شب کے پرستاروں کو نوازا جا رہا تھا۔ اجالوں کے متوالوں کے مقدر میں اسیری اور دار و رسن کی آزمائش لکھ دی گئی تھی۔ ایوب خان کے زمانے میں عدلیہ حکمران طبقے کی محکوم بن چکی تھی۔ وہ آزادی بھی سلب کر لی گئی تھی جو اسے برطانوی عہد غلامی میں حاصل تھی۔ حسن ناصر جو پرولتاری جذبے سے معمور تھے۔ اندھیرے کو اُجالا اور رات کو دن نہ کہہ سکے۔ ایوب خان کی مدح سرائی نہ کر سکے۔ ایوب خانی انقلاب کو "انقلاب" نہ کہہ سکے۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا۔ مقدمہ درج کیا گیا۔ لیکن انصاف جو اس معاشرے میں پہلے ہی جھنگا تھا۔ ایوبی دور میں عنقا ہو چکا تھا۔ ظالموں پر گرفت نہ ہو سکی۔ تو ایک شاعر پکار اُٹھا

پیشانی پہ چوٹوں کے جو تیلے سے نشان ہیں
اس ملک کی تہذیب پہ وہ مرثیہ خواں ہیں

چہرے پہ تبسم کی جو ہلکی سی کرن ہے
اس قوم کے معیار عدالت کا کفن ہے

حسن ناصر ۱۳ نومبر کو شہید کر دیے گئے۔ پولیس نے عوام

"انسان کے دونوں جانب قلعے ہیں انھیں مسمار کردو"

میجر اسحاق محمد



مزدور کسان پارٹی کے صدر اسحاق محمد

کوان کی شہادت کی ہوا تک نہ دی۔ پولیس کو یہ گمان تھا۔ کہ قلعہ کی سنگین دیواروں کے پیچھے ہونے والے خونیں ڈرامے عوام کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ حسن ناصر کی شہادت پر بھی پردہ پڑا رہے گا۔ لیکن حسن ناصر کا لہو خاموش نہ رہ سکا ع

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے پاکستان میں پھیل گئی۔ حسن ناصر کے دوست میجر اسحاق محمد (میجر صاحب مزدور کسان پارٹی کے صدر ہیں۔ اور اخباری اطلاعات کے مطابق آج کل قلعہ لاہور میں پابند سلاسل ہیں) نے ۲۲ نومبر ۱۹۶۰ء کو حکومت پاکستان، حکومت مغربی پاکستان، ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی، آئی، ڈی، مغربی پاکستان، ڈپٹی انسپکٹر جنرل جیل مغربی پاکستان کے خلاف ایک مقدمہ ہائی کورٹ لاہور میں دائر کیا۔ مقدمہ کا نمبر کرمنل مسلینئس نمبر ۱۹۲۸ آف ۱۹۶۰ء مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۰ء تھا، وکیل استغاثہ میاں محمود علی قصوری تھے، استغاثہ میں کہا گیا کہ درخواست گزار حسن ناصر کا دوست ہے۔ حسن ناصر قلعہ لاہور میں پابند سلاسل ہے۔ گذشتہ دو دن سے لاہور اور کراچی میں یہ خبر گشت کر رہی ہے۔ کہ حسن ناصر کو قتل کر دیا گیا ہے یا وہ قید ہی میں مر گیا ہے۔ گذشتہ روز حسن ناصر کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لئے سی آئی ڈی کے حکام سے متعدد بار رابطہ قائم کیا۔ لیکن حکام نے ٹال مٹول سے کام لیا درخواست گزار بھی قلعہ لاہور میں ایام اسیری بسر کر چکا ہے وہاں کے حالات جانتا ہے۔ اس لئے اپنے دوست کی جان اور سلامتی کے بارے میں مختلف اندیشوں میں مبتلا ہے اس لئے اُسے عدالت میں پیش کیا جائے اور اگر ہو سکے تو رہا کر دیا جائے

وکیل استغاثہ میاں محمود علی قصوری کے دلائل سننے کے بعد مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب ایم آر کیانی نے حسن ناصر کو فوراً عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ ہائی کورٹ کے حکم کے جواب میں مغربی پاکستان کے ڈپٹی ہوم سیکرٹری نے مطلع کیا کہ حسن ناصر نے ۱۳ نومبر کو خودکشی کر لی۔ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جسٹس شبیر احمد کی عدالت میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری کا جو خط پیش کیا گیا اس میں تحریر تھا۔

"سی۔ آئی۔ ڈی نے اطلاع دی ہے۔ کہ حسن ناصر کو ۶ اگست کو کراچی میں گرفتار کیا گیا اور سکیورٹی ایکٹ آف پاکستان کے تحت ایک سال کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ اُس نے ۱۳ نومبر کو خودکشی کر لی اب کوئی اتنی جلدی نہیں ہے۔ تاہم مسٹر محمود علی قصوری جرح کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے مقدمے کی کارروائی کل پر (بدھ) رکھی جائے"!

۲۳ نومبر ۱۹۶۰ء کو استغاثہ کی جانب سے جسٹس شبیر احمد کی عدالت میں جرح شروع ہوئی۔ وکیل استغاثہ مسٹر قصوری نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ چیف جسٹس کے حکم کے جواب میں حکومت نے جو اطلاع دی ہے جو غیر واضح اور مبہم ہے، ڈپٹی ہوم سیکرٹری نے صرف اتنا لکھا ہے۔ کہ سی آئی ڈی کی اطلاع کے مطابق حسن ناصر نے خودکشی کر لی ہے موت کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کیا گیا۔ اور ڈپٹی ہوم سیکرٹری نے اپنے خط میں یہ بھی نہیں بتایا کہ خودکشی کی تحقیقات کون کر رہا ہے اور وہ کہاں تک مکمل ہوئی ہے۔ مسٹر قصوری نے اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا کہ حسن ناصر پاکستان کا ایک شہری تھا۔ اسے قانون تحفظ پاکستان کے تحت قلعہ لاہور میں پابند سلاسل رکھا گیا۔ کسی شخص کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ اور اب اس کی موت کے دس دن بعد سی آئی ڈی نے صرف یہ اطلاع دی کہ اس نے خودکشی کر لی ہے۔ لیکن یہ اب بھی نہیں بتایا گیا۔ اُس نے کیسے اور کیوں خودکشی کی اور اُسے کہاں اور کب دفنایا گیا۔

وکیل استغاثہ کے دلائل سن کر فاضل عدالت نے یہ فیصلہ سنایا کہ۔

"فاضل وکیل استغاثہ زور دے رہے ہیں کہ عدالت عالیہ کے حکم کے مطابق نظر بند کو فوری طور پر پیش کرنے کے بارے میں جو رپورٹ مہیا کی گئی ہے۔ وہ رپورٹ مرتب کرنے والے کے ذاتی علم پر مبنی نہیں، اس لئے اسے تسلیم نہ کیا جائے اس دلیل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس لئے میں حکم دیتا ہوں ایسے فرد کا حلف نامہ عدالت میں پیش کیا جائے۔ جو حسن ناصر کی موت اور اس کے اسباب پر ذاتی علم رکھتا ہو مقدمہ کی اگلی پیشی اس ماہ کی ۲۵ تاریخ کو ہوگی۔ حکومت کو بھی اس کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ کیونکہ چند اہم سوالات پیدا ہونے کے امکانات ہیں، اگر کسی مجسٹریٹ نے تحقیقات کی ہیں۔ وہ اس عدالت کو بھیج دی جائیں۔ اگر مجسٹریٹ نے اپنی تحقیقات مکمل نہیں کیں تو استغاثہ کو تحقیقات میں حصہ لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ تحقیقات عدالتی تحقیقات تھیں اگر مجسٹریٹ کی تحقیقات غیر مکمل ہوں، تب بھی وہ مطالعہ کے لئے اس عدالت میں بھیج دی جائیں۔"

مغربی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل مسٹر ایم انور نے ۲۵ نومبر ۱۹۶۰ء کو حسن مصطفےٰ اسسٹنٹ ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی مغربی پاکستان، سی آئی ڈی کے ایس پی شہزادہ حبیب اور شبیر حسین خان لائنز آفیسر سی آئی ڈی قلعہ لاہور کے حلف نامے عدالت میں داخل کئے۔

"یہ میرے بیٹے کی نعش نہیں" شہید حسن ناصر کی والدہ کا بیان



حسن ناصر شہید کی والدہ محترمہ

حسن مصطفےٰ نے اپنے حلف نامے میں کہا کہ حسن ناصر کو کراچی کی انتظامیہ کے احکامات پر نظر بند کیا گیا۔ اور تفصیلی پوچھ گچھ کے لئے ۱۳ ستمبر کو لاہور لایا گیا۔ پوچھ گچھ ۲۴ اکتوبر کو مکمل ہو گئی۔ ۲۹ اکتوبر کو ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی نے ایس پی سی آئی ڈی کراچی کو ایک برقی پیغام بھیجا کہ اب لاہور میں نظر بند کی ضرورت نہیں اسے واپس بلایا جائے۔ ۵ نومبر کو دوبارہ پیغام بھیجا گیا۔ حسن مصطفےٰ نے حلف نامہ میں مزید کہا کہ حسن ناصر "موڈی، اکل کھرا اور بدمزاج" ہو گیا تھا۔ کیونکہ پوچھ گچھ کے دوران اپنے کئی دوستوں اور ساتھیوں کی نشان دہی کی تھی جو زیر زمین کام کر رہے تھے۔ اپنے انکشاف کے بعد وہ خائف تھا۔ کہ کہیں وہ گرفتار نہ کر لئے جائیں۔ شاید اسی لئے وہ بدمزاج اور اکل کھرا ہو گیا تھا۔ حسن مصطفےٰ نے کہا کہ اپنے ساتھیوں کی نشان دہی کے بعد اس نے یہ خواہش ظاہر کی تھی۔ کہ اس کے ساتھیوں کو گرفتار نہ کیا جائے۔ تحقیقاتی افسر نے اسے اس بات کی ضمانت دی تھی۔ کہ اس کے ساتھیوں کو گرفتار نہیں کیا جائیگا اور ایس پی کراچی کو بھی اس بات کی ہدایت کر دی گئی تھی۔

حسن مصطفےٰ نے اپنے حلف نامے میں یہ بھی کہا کہ ۱۳ نومبر کو تقریباً بارہ بج کر چالیس منٹ پر لائنز آفیسر قلعہ لاہور نے ٹیلی فون پر مجھے اطلاع دی کہ "گیارہ بجے کے قریب حسن ناصر نے اپنے ازار بند سے لٹک کر خودکشی کر لی"۔ حلف نامے کے مطابق حسن مصطفےٰ فوری طور پر ایس پی شہزادہ حبیب کے ہمراہ قلعہ لاہور روانہ ہوئے اور راستے میں پولیس سرجن ڈاکٹر صدیق حسین کو بھی ہمراہ لے لیا۔ قلعہ لاہور میں حسن ناصر کے جسم کا معائنہ کرنے کے بعد پولیس سرجن نے اس کی موت کا اعلان کر دیا۔ موت کی اطلاع ٹبی تھانے کے ایس۔ ایچ۔ او کو دے دی گئی تاکہ وہ پوسٹ مارٹم کے انتظامات کرے۔

حسن مصطفےٰ نے مزید بتایا کہ خودکشی کی تصدیق ابھی تک نہیں ہو سکی ہے کیونکہ ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم کر کے جسم کی مختلف آلائشوں کو کیمیائی تجزیہ کے لئے کیمیکل ایگزیمنر کو بھیج دیتے تھے جس کی رپورٹ ابھی تک موصول نہیں ہوئی ہے سٹی مجسٹریٹ اس کیس کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ صرف پولیس سرجن جس نے پوسٹ مارٹم کیا، کا بیان باقی رہ گیا ہے۔ کیمیکل ایگزیمنر کی رپورٹ آنے پر اس کا بیان بھی لے لیا جائے گا۔

حسن مصطفےٰ نے یہ بھی بتایا کہ قلعہ لاہور میں حسن ناصر کا چار مرتبہ طبی معائنہ کیا گیا، ۲۴ ستمبر، ۱۳، ۱۵ اور ۲۹ اکتوبر کی تاریخوں میں اس امر کا اندراج بھی موجود ہے۔ ان تاریخوں کا طبی معائنہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس کی صحت ٹھیک تھی۔ مصطفےٰ نے اپنے حلف نامے میں یہ بھی کہا کہ حسن ناصر کی موت کی اطلاع کراچی میں ان کے ماموں ڈاکٹر مہدی حسن کو دی گئی تو انہوں نے میت کو لینے کی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔ بلکہ شیعہ عقائد کے مطابق حسن ناصر کو لاہور ہی میں دفن کرنے کی ہدایت کی چنانچہ ڈاکٹر مہدی حسن کی خواہش کا پاس رکھا گیا۔

دوسرا حلف نامہ قلعہ لاہور کے لائنز آفیسر شبیر حسین خان اے ایس آئی کا تھا۔ اس نے اپنے حلف نامے میں کہا کہ ۱۳ نومبر کو گیارہ بجے کے قریب بخشا جمعدار نے اطلاع دی کہ حسن ناصر اپنی کوٹھری میں لٹکا ہوا ہے یہ اطلاع ملتے ہی وہ فوراً کوٹھری میں گیا۔ تو دیکھا کہ وہ کیل سے ازار بند باندھ کر جس کا پھندا اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا، لٹکا ہوا ہے"! حسن ناصر کو اُتار کر مصنوعی تنفس کے ذریعے اُس کا سانس بحال کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔ اس پر شبیر حسین خان نے اس حادثے کی اطلاع ڈپٹی انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی کو اس کے گھر پر فون پر دی۔

اے ایس آئی شبیر حسین خان نے بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر سٹی مجسٹریٹ قلعہ میں پہنچ گئے اور انہوں نے متعدد گواہوں کے بیانات لئے۔

شہزادہ حبیب ایس پی، سی آئی ڈی نے اپنے حلف نامے میں کہا کہ ۲۰ یا ۲۱ نومبر کو محمود علی قصوری نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ انہوں نے حسن ناصر کی ہلاکت کی افواہ سنی ہے۔ مسٹر قصوری نے اس کی تصدیق چاہی تھی۔ میں نے محمود علی قصوری کو بتایا کہ یہ افواہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ حسن ناصر کو کراچی کی انتظامیہ کے احکامات پر نظر بند کیا گیا تھا اور مجھے اپنے محکمہ کے افسر اعلیٰ نے اطلاعات دینے کی اجازت نہیں دی تھی۔ شہزادہ حبیب نے یہ بھی بتایا کہ سٹی مجسٹریٹ مسٹر ایم۔ این۔ رضوی نے اپنی تحقیقات ابھی مکمل نہیں کی ہیں۔

حلف ناموں اور سٹی مجسٹریٹ کی نامکمل تحقیقات کو عدالت عالیہ میں پیش کرتے ہوئے ایڈووکیٹ جنرل نے کہا کہ اب یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ حسن ناصر ۱۳ نومبر کو موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اس کی اطلاع ان کے ماموں ڈاکٹر مہدی حسن مقیم کراچی کو دی گئی۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے کراچی کے سی آئی ڈی کے حکام کو بتایا کہ اس واقعہ سے انہیں سخت صدمہ ہوا ہے۔ اور وہ تدفین کا انتظام کرنے سے قاصر ہیں انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ لاہور کے حکام تدفین کر دیں۔ اور وہ تمام اخراجات ادا کرنے کے لئے تیار تھے۔ ایڈووکیٹ جنرل نے بتایا کہ پولیس سرجن نے معائنہ کے بعد تصدیق کر دی تھی کہ مرحوم نے خودکشی کی تھی۔ اور پوسٹ مارٹم کے بعد حسن ناصر کو میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ایڈووکیٹ جنرل ایم۔ انور نے وکیل استغاثہ کے اس الزام کو کہ حسن ناصر کو قلعہ لاہور میں شہید کر دیا گیا تھا کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ مرحوم سے پوچھ گچھ ۲۴ اکتوبر کو ختم ہو گئی تھی۔ اور سی آئی ڈی کراچی سے کہا گیا تھا۔ کہ وہ مرحوم کو اپنی تحویل میں لے لیں۔ کیونکہ اب انہیں لاہور میں رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تحقیقات مکمل ہونے کے بعد مرحوم کو اذیتیں دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کی صحت اچھی تھی۔ اور قلعہ لاہور میں چار مرتبہ طبی معائنہ کیا گیا۔

ایڈووکیٹ جنرل نے اپنی بحث جاری رکھتے ہوئے حسن ناصر کی والدہ کا ایک خط دکھایا جو بقول ان کے حسن ناصر

"میں غیر جانبدارانہ اور بلاخوف عدالتی تحقیقات نہیں کرسکتا" انکوائری مجسٹریٹ

کی کوٹھری سے ملا تھا۔ اس خط میں حسن ناصر کی والدہ نے لکھا تھا کہ ان کی گرفتاری کی وجہ سے ان کے والد ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں اور ان کی صحت دن بدن گرتی جارہی ہے۔ ایڈووکیٹ جنرل نے یہ خط پیش کرتے ہوئے یہ دلیل دی کہ ہوسکتا ہے کہ اس خط کی وجہ سے حسن ناصر ذہنی طور پر مفلوج ہوگئے ہوں اور مایوسی کے عالم میں خودکشی کرلی ہو۔ ایڈووکیٹ جنرل نے جرح جاری رکھتے ہوئے کہا کہ استغاثہ کا یہ الزام کہ حسن ناصر کی موت کا باعث جسمانی اذیتیں ہیں، بالکل بے موقع اور نامناسب ہے کیونکہ موت کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ابھی تک عدالتی تحقیقات ہورہی ہیں۔

مدعی کی جانب سے ایک اور درخواست عدالت عالیہ کو دی گئی جس میں مقدمہ کی اہمیت کے پیش نظر مقدمہ کو عدالت عالیہ میں منتقل کرنے، اب تک کی تحقیقات کو خارج کرنے اور ممتاز اور اہم ڈاکٹروں سے لاش کا معائنہ کرانے کی استدعا کی گئی۔ وکیل استغاثہ نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ تحقیقات بند کمرے میں ہوئی ہیں۔ اور صرف ان افراد کو ہی مجسٹریٹ کی معاونت کرنے کی اجازت دی گئی جو کہ براہِ راست اس حادثے سے تعلق رکھتے ہیں! ایسی تحقیقات سے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے اس لئے متعلقہ اطلاعات جمع کرنے کے لئے مدعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ قلعہ لاہور کے دوسرے قیدیوں، ادنیٰ ملازموں اور پولیس کے حکام سے ملے۔ تاکہ معلوم کرسکے کہ حسن ناصر کو شہید کیا گیا تھا یا وہ اپنی موت مرے۔

مسٹر محمود علی قصوری نے بحث جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میں اس واقعہ کی تحقیقات کا ہونا اس لئے بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ سی آئی ڈی کے حکام نے حسن ناصر کی موت کو چھپایا۔ مدعی جب تک قلعہ لاہور کے قیدیوں، ادنیٰ ملازموں اور پولیس کے حکام سے ملاقات کرکے اصل واقعات سے آگاہ نہیں ہوتا اس وقت تک سی آئی ڈی کے حکام کے حلف ناموں کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے اس کے علاوہ جن افسروں اور گواہوں نے سٹی مجسٹریٹ کی تحقیقات میں بیانات دیئے ہیں وکیل استغاثہ کو ان سے جرح کرنے کا موقع دیا جائے۔ وکیل استغاثہ نے یہ بھی کہا کہ پولیس سرجن نے پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ مرحوم کے دوستوں، مدعی کی تسلی و تسکین اور عوامی مفادات کے پیش نظر ڈاکٹروں کے بورڈ سے لاش کا دوبارہ معائنہ کروانا نہایت ضروری ہے۔

جسٹس شبیر احمد نے وکیل استغاثہ کے دلائل سننے کے بعد درخواست مسترد کردی۔ اور دو فیصلے سنائے گئے۔

"مدعا الیہ کی جانب سے جو حلف نامے پیش کئے گئے ہیں ان کے مطابق اس عدالت میں مدعی نے حسن ناصر کو عدالت میں پیش کرنے کی جو درخواست پیش کی تھی۔ وہ انتقال کرچکے ہیں۔ مسٹر محمود علی کا بیان ہے کہ اس موقع پر وہ یہ قبول کرنے سے قاصر ہیں کہ حلف ناموں کی رو سے حسن ناصر نے خودکشی کرلی ہے۔ لیکن جو مواد ریکارڈ پر موجود ہے اس کی روشنی میں وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ حسن ناصر زندہ نہیں جس ناصر حسن کی رہائی کے لئے استغاثہ دائر کیا گیا تھا۔ وہ مرچکے ہیں بنا بریں استغاثہ غیر موثر ہوجاتا ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر خارج کیا جاتا ہے۔"

"مدعی میں تین مراعات طلب کی ہیں۔ ایک یہ کہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۶ کے تحت سٹی مجسٹریٹ لاہور مسٹر ایم۔ این۔ رضوی کی عدالت میں زیر سماعت مقدمے کو اس عدالت میں منتقل کردیا جائے۔ میرے نزدیک کوئی جواز نہیں کہ استغاثہ کی اس استدعا کو تسلیم کرلیا جائے مدعی نے یہ بھی درخواست کی ہے کہ مسٹر رضوی نے جو کارروائی کی ہے اسے ختم کردیا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی بنیاد پر ایسا کیا جاسکتا ہے۔ استغاثہ نے یہ بھی استدعا کی ہے کہ حسن ناصر کی نعش کو نکال کر ذمہ دار ڈاکٹروں سے دوبارہ معائنہ کرایا جائے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ حسن ناصر تشدد سے مرے ہیں یا انہوں نے خودکشی کی ہے۔ جیسا کہ حسن ناصر کی موت نے کسی حد تک اہمیت اختیار کرلی ہے ایڈووکیٹ جنرل نے آمادگی ظاہر کردی ہے کہ مدعی اور ان کے وکیل کو انکوائری میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی۔ متعلقہ مجسٹریٹ مدعی اور ان کے وکیل ان گواہوں کے بیانات پر بھی جرح کرنے کا موقع دیں گے، جو پہلے ہی قلمبند ہوچکے ہیں۔"

"مناسب موقع پر متعلقہ مجسٹریٹ لاہور قلعہ میں اس مقام پر بھی انکوائری کرسکتے ہیں۔ جہاں حسن ناصر کی موت واقع ہوئی مدعی کو یہ موقع دیا جائے گا۔ کہ وہ زیر غور مسئلے پر شہادتیں مہیا کرسکیں۔ نعش کے طبی معائنہ کی درخواست

قصوری ایڈووکیٹ جنرل کی دھمکی سُن کر کراچی بھاگ گئے

دیکھنے والوں کے لئے کوئی جگہ نہیں!

قصوری صاحب نے حسن ناصر شہید کے مقدمہ میں بزدلی کا ثبوت دیا۔ ایڈووکیٹ جنرل مغربی پاکستان نے انہیں گرفتار کرنے اور قلعہ لاہور میں بند کرنے کی دھمکی دی تو موصوف کراچی بھاگ آئے۔ اور مقدمہ کی پیروی مدعی — میجر اسحاق محمد کو خود کرنی پڑی۔

اب قصوری صاحب نے موقع پرستی کا ثبوت یہ دیا کہ مشرقی پاکستان میں صرف چھ نشستوں کی خاطر جماعت اسلامی ایسی رجعت پسند، سامراج نواز جماعت کی گود میں بیٹھ گئے۔ اور جوش خطابت میں مسلح رضاکاروں کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے۔ حالانکہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین اپنے مضمون (مطبوعہ الفتح ۲-۹ ستمبر ۱۹۷۱ء) میں رضاکاروں پر قتل عام کا الزام لگاچکے ہیں۔



میاں محمود علی قصوری بین الاقوامی شہرت کے وکیل ہیں، موصوف کو بعض حلقے سامراج دشمن اور سوشلسٹ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ سیاسی میدان میں یہ ہمیشہ سامراج دشمن اور ترقی پسند جماعتوں سے وابستہ رہے۔ لیکن درحقیقت وہ رجعت پسند ہیں، یادداشت بتجر جب نیشنل عوامی پارٹی نے پارٹی کا منشور سوشلسٹ بنیادوں پر بنانے کی قرارداد پیش کی، تو قصوری صاحب بوکھلا گئے اور ترقی پسندی کا نقاب اپنے چہرے سے نوچتے ہوئے کہا کہ "ہماری پارٹی میں کمیونسٹ شامل ہوگئے ہیں میں واضح کردینا چاہتا ہوں کہ ہماری پارٹی میں سوشلسٹ حضرات اور خونی انقلاب کا خواب

الفتح

"حسن ناصر نے ازار بند سے لٹک کر خودکشی کی" پولیس کا مؤقف

انکوائری مجسٹریٹ سے کی جائے۔ وہی اس بات کے مجاز ہیں کہ آیا نعش کا معائنہ ہونا چاہیئے۔ اس حکم کی نقل فوری طور پر مجسٹریٹ کو بھیج دی جائے۔"

"کیونکہ تمام کارروائی عدالتی نوعیت کی ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عام شہری انکوائری میں حاضر ہو سکتے ہیں تاوقتیکہ مجسٹریٹ اس کے برعکس کوئی حکم جاری نہ کرے مدعی جب انکوائری ریکارڈ کا معائنہ کر لے تو اسے آج ہی فوراً مجسٹریٹ کو لوٹا دیا جائے۔"

اسی روز ۲۵ نومبر ۱۹۶۰ء کو مدعی نے سٹی مجسٹریٹ جو کہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۶ کے تحت انکوائری کر رہے تھے سے رجوع کیا اور درخواست پیش کی کہ سید حسن ناصر کی نعش کا نئے سرے سے پوسٹ مارٹم کرایا جائے سٹی مجسٹریٹ نے اس پر کوئی حکم جاری کرنے سے انکار کر دیا اور ریمارک دیا کہ انہوں نے پولیس کے حق میں رائے قائم کر لی ہے اس لئے غیر جانبدارانہ انکوائری نہیں کر سکتے اور سا نہوں نے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کو یکھ کر فائل بھیج دی کہ انکوائری کسی دوسرے مجسٹریٹ سے کرائی جائے۔

چنانچہ مدعی نے ۲۶ نومبر ۱۹۶۰ء کو ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۶ (۲) کے تحت ایک درخواست دی اور نعش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے کی استدعا کی۔ فاضل عدالت نے ہائی کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں اس استدعا کو مسترد کر دیا اور سٹی مجسٹریٹ کی انکوائری میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا۔ مدعی نے کیس کی اہمیت اور جلد نوعیت بیان کی تو فاضل اے ڈی ایم نے اسی دن (۲۶ نومبر ۱۹۶۰ء) فائل ہائی کورٹ بھیج دینے کا وعدہ کیا۔

۲۸ نومبر کو مدعی میجر اسحاق محمد نے یہ سمجھتے ہوئے کہ فائل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت سے ہائی کورٹ منتقل ہو چکی ہو گی سٹی مجسٹریٹ کے حکم مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۶۰ء اور ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۶۰ء کی تصدیق شدہ نقول حاصل کرنے کے لئے ایک اور درخواست ہائی کورٹ میں دی لیکن مدعی کو بتایا گیا کہ فائل ابھی تک ہائی کورٹ میں منتقل نہیں ہوئی۔ اس لئے مدعی فوری طور پر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے۔ فائل کی بابت معلوم کیا اور یہ جان کر حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ فائل بغیر کسی حکم کے سٹی مجسٹریٹ کو واپس کر دی گئی تھی۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فائل کا کیا ہوا؟ مدعی اسی دن سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں گئے۔ مدعی کے ساتھ ایک وکیل جناب منظر بشیر بھی تھے۔ مدعی نے دیکھا کہ سٹی مجسٹریٹ اپنے چیمبر میں بیٹھے ہوئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک طویل خط لکھ رہے ہیں کہ کن اسباب کی بنا پر وہ انکوائری نہیں کر سکتے اور اس لئے انہوں نے فائل ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھیج دی تھی۔ لیکن فاضل ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کسی نے ہدایت کے بغیر واپس کر دی

تقریباً چار بجے کا وقت تھا جب مدعی اور مسٹر بشیر سٹی مجسٹریٹ کے چیمبر سے نکلے اس وقت تک فائل سٹی مجسٹریٹ ہی کے پاس تھی۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۰ء کو ایک نوٹس مجریہ ۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء از عدالت مسٹر عظمت اللہ مجسٹریٹ درجہ اول با اختیارات دفعہ ۳۰، ملک مقصود احمد انسپکٹر انچارج لاہور قلعہ نے ۲ بج کر ۳۰ منٹ پر مدعی کے حوالے کیا جس کے مطابق مدعی کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اسی روز ساڑھے تین بجے مذکورہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوں اس نوٹس کا مقصد سید حسن ناصر کی موت کے سلسلے میں

حسن ناصر کمیونسٹ تھے

اور اسحاق محمد

اُن کے ساتھی ہیں

(ایڈووکیٹ جنرل)

تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۶ کے تحت ہونے والی انکوائری میں مدعی کو طلب کیا گیا تھا۔

فائل کی اس طرح کی منتقلی پر مدعی نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۵۲۶ کے تحت درخواست پیش کی کہ مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا جائے۔ کیونکہ پولیس کے رویہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس انکوائری میں کوئی مجسٹریٹ غیر جانبدارانہ اور بلاخوف ہو کر زیادہ دیر تک انکوائری نہیں کر سکتا۔

۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء کا استغاثہ اور مقدمے کی منتقلی سے متعلق درخواست مسٹر جسٹس شبیر احمد کی عدالت میں ۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء کو سماعت کے لئے پیش ہوئیں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۶۰ء کے استغاثہ میں مدعی نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۶ (۱) دفعات (بی اور سی) کی روشنی میں استدعا کی تھی کہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۶ کے تحت ہونے والی کسی بھی انکوائری کے لئے ضروری نہیں کہ کسی الزام کو حقیقت کا رنگ دے کر ارتکاب جرم کے شک سے فائدہ اٹھایا جائے۔ قانون کا تقاضہ ہے کہ پولیس کی تحویل میں وفات پانے والے کسی بھی فرد کی ہلاکت کے اسباب معلوم کرنے کے لئے وسیع پیمانے پر انکوائری کی جائے تاکہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ اور اگر کوئی شخص پولیس کی تحویل میں خودکشی کر لیتا ہے تو حکام اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے خودکشی کے محرکات اور اسباب معلوم کرنے ضروری ہیں کہ مبادا پولیس نے اسے خودکشی کرنے پر تو مجبور نہیں کیا۔

وکیل استغاثہ نے دلائل دیتے ہوئے لکھا کہ متوفی کی نعش کا غیر جانب دارانہ معائنہ کیس کا لازمی حصہ ہے کیونکہ :-

(۱) پولیس نے جان کر ایک منظم منصوبے کے تحت متوفی کی موت کو عوام سے پوشیدہ رکھا۔

(۲) یہاں تک کہ جب مدعی اور مسٹر قصوری نے پولیس سے رابطہ قائم کیا۔ تو اس نے نہ صرف متوفی کی موت کو چھپایا بلکہ متوفی کی لاہور میں آمد اور موجودگی کو بھی غلط قرار دیا۔

(۳) تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۶ کے تحت ہونے والی انکوائری کو خفیہ رکھا۔ حالانکہ کھلی عدالت میں انکوائری ہونی چاہیئے تھی،

(۴) سٹی مجسٹریٹ کے سامنے جن چھ گواہوں نے شہادت دی اور ڈاکٹر جس نے متوفی کا پوسٹ مارٹم کیا وہ سب کے سب پولیس والے تھے اس

دوبارہ پوسٹ مارٹم سے پہلے قبر کے اردگرد پولیس اور گورکن کیا کر رہے تھے؟

طرح کی انکوائری تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۶ کے معیار پر پوری نہیں اترتی ۔ ۔ ۔ ۔

۵ واقعہ سے براہ راست متعلق اور واقعہ سے اتفاقاً آگاہ ہونے والے گواہوں کی شہادتیں بھی نہایت اہم اور ضروری ثابت ہو سکتی تھیں ۔

(۶) حسن ناصر مضبوط کردار اور قوت ارادی کا مالک تھا وہ خودکشی نہیں کر سکتا ۔ اور نہ ہی کوئی ایسی ناقابل تو غیر حرکت کر سکتا ہے جب تک کہ اس پر ناقابل برداشت دباؤ نہ ڈالا جائے قلعہ لاہور جیسی بنجر جگہ میں پوچھ گچھ کے لئے نہ رکھا جائے ۔

یہ بھی کہا گیا کہ متوفی کی موت ۱۳ نومبر کو ہوئی تھی ہر گزرنے والی گھڑی موت کے اصلی وجہ پر پردے ڈال رہی ہے پولیس اور فاضل مجسٹریٹ آزاد اور قابل ڈاکٹروں سے نعش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے میں قطعاً ناکام رہے ہیں مدعی کی جانب سے توجہ دلانے کے باوجود فاضل مجسٹریٹ اور فاضل ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اپنی بنیادی فرض کی ادائیگی نہیں کر سکے ۔ اس لئے فاضل ہائی کورٹ معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر نعش کا فوری طور پر پوسٹ مارٹم کرنے کے احکامات جاری کرے یہ بھی استدعا کی گئی کہ اس واقعہ میں عوامی اور انسانی مسائل کی اہمیت اور اعلیٰ پولیس حکام کی دلچسپی کے پیش نظر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو رہے اس لئے مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا جائے

مسٹر محمود علی قصوری لاہور سے کراچی چلے گئے تھے ۔ اس لئے مدعی میجر اسحاق محمد نے ہائی کورٹ میں خود جرح کی مغربی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل ایم ۔ انور غصہ سے بھرے بیٹھے تھے ۔ یونہی مدعی نے دلائل پیش کرنے شروع کئے ۔ ایڈووکیٹ جنرل کھڑے ہو گئے اور مدعی پر الزام لگایا کہ انہوں نے حکومت اور اس کے حکام عدلیہ اور انتظامیہ دونوں کے خلاف ایک باقاعدہ مہم شروع کر دی ہے مسٹر ایم ۔ انور نے الزام لگایا کہ حسن ناصر ایک تخریب پسند کمیونسٹ تھے، اور مدعی میجر اسحاق محمد اس کے ساتھی تھے ۔ اس پر مدعی نے کہا کہ ایڈووکیٹ جنرل عدالتی کارروائی کو سیاسی تعصب کے رنگ میں ڈھال رہے ہیں اور مدعی کو ایک طرح کی دھمکی دے رہے ہیں اور مختلف حلقوں میں یہ خبر گرم ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل نے اپنی نجی محفل میں کہا تھا کہ وہ وکیل استغاثہ مسٹر محمود علی قصوری کو لاہور قلعہ میں بند کروا دیں گے ۔ مدعی نے بحث جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس کیس کو سیاسی رنگ دینے کی بجائے صرف عدلیہ تک محدود رکھا جائے یہاں قانون کی حاکمیت اور شہریوں کی جان کی سلامتی و تحفظ کا سوال ہے ایک فرد سے محض اس لئے بدسلوکی اور ناروا برتاؤ رکھنا کہ وہ کمیونسٹ ہے کوئی منصفانہ دلیل نہیں، کمیونسٹ کتنے کمیونسٹ ماسٹر بن سکتے ہیں لیکن یہ نہایت قابل افسوس بات ہو گی اگر وہ ایڈووکیٹ جنرل جیسے انٹی کمیونسٹ سے کتوں، جیسا سلوک کریں ۔ انسان کی دونوں جانب قلعے تعمیر کر دیئے گئے ہیں انسانیت کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ ان قلعوں کو مسمار کر دیا جائے ۔

جسٹس شبیر احمد نے دونوں فریقین کے دلائل سننے کے بعد یہ فیصلہ دیا ۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقدمہ خاصی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے ۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

" مجھے میرے بیٹے کی لاش ہی دیدو "
حسن ناصر کی ماں کی پکار

بذات خود اس مقدمے کو سنیں مقدمہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کو منتقل کیا جاتا ہے ایڈووکیٹ جنرل مسٹر انور کو جو اسی مقدمے کی دوسری درخواست کے سلسلہ میں عدالت میں حاضر ہیں اس منتقلی پر کوئی اعتراض نہیں ۔"

" مسٹر اسحاق محمد نے اپنی استدعا میں متوفی کی نعش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کروانے پر زور دیا ہے اُسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس سلسلے میں درخواست دینی چاہئے اور درخواست کے ساتھ ایسا حلف نامہ منسلک ہونا ضروری ہے جس سے ثابت ہو کہ دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانا ضروری ہے اگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس استدعا کو قبول نہیں، کرتا تو قانون کے مطابق اعلیٰ عدالت مدعی کے لئے کھلی ہوئی ہے تمام ریکارڈ بغیر کسی تاخیر کے آج ہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھیج دیا جائے تاکہ وہ آج سے کارروائی شروع کر دے ۔"

" دوسری درخواست جس میں مدعی نے مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل کرنے کی استدعا کی ہے، مسترد کی جاتی ہے ۔ کیونکہ میں مقدمہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو منتقل کر چکا ہوں ۔"

" مدعی کی دوسری استدعا یہ ہے کہ اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کیمیکل ایگزمنر کی رپورٹ دیکھنے کی اجازت دی جائے یہ دونوں دستاویزات ریکارڈ میں موجود ہیں ۔ متعلقہ حکام کو درخواست دے کر مدعی ان دستاویزات دیکھ سکتا ہے ۔"

" مدعی کے ایک اور استدعا ہے کہ مسٹر حسن ناصر کی قبر کی نشان دہی کی جائے، مدعی نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس کی یہ درخواست جذبات پر مبنی ہے، میں نہیں سمجھتا قانونی عدالت اس کی اجازت کیوں دے اگر نعش کو نکالنے کی اجازت مل جاتی ہے تو مدعی کو خود بخود قبر کا علم ہو جائے گا (نوٹ :۔ مدعی نے جو درخواستیں ہائی کورٹ میں دی ہیں ان کے ساتھ حلف نامے موجود ہیں)۔"

مدعی نے اسی دن قائم مقام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ چھٹی پر تھے) کو حسن ناصر کی نعش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے کی درخواست دی یہ درخواست مسترد کر دی گئی ۔ اس عدالت میں اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل ایم بی زمان نے ایڈووکیٹ جنرل کا نظریہ دہرایا کہ عدالتوں کو پروپیگنڈا کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔

اگلے دن یعنی یکم دسمبر ۱۹۶۰ء کو مدعی نے ہائی کورٹ میں قائم مقام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فیصلے مجریہ ۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء کا از سر نو جائزہ کے لئے درخواست دی ۔ اس درخواست کی ابتدائی سماعت

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمائیں

راز اعظمی

حسن ناصر (شہید) سے

السّلام اے عظمتِ مزدور کے روشن نشاں   السّلام اے کشتۂ جور و ستم کی داستاں
السّلام اے رہبرِ تحریکِ مزدور کساں   السّلام اے حریت کے ایک بحرِ بے کراں

آج تیرے بعد اِک جم غفیر نو جواں
دیکھ آگے بڑھ رہا ہے شاد کام و کامراں

تو نے جس تحریک کو سینچا ہے اپنے خون سے   منزلِ مقصود تک لے جائیں گے اب ہم اُسے
راستے میں آگ یا پھر خون کا دریا ملے   کچھ بھی ہو بڑھتے رہیں گے قافلے در قافلے

اے حسن ناصر شہیدِ جبر و استبداد سُن
اب تو منزل تک پہنچنے کی لگی ہے ہم کو دھن

تو نے اپنی جان دیکر راہ جو دکھلائی ہے   ہم نے بھی اُس پر ہی چلنے کی قسم اب کھائی ہے
آج کل حرص و ہوس کی اک گھٹا سی چھائی ہے   ایک طبقہ جبر و استحصال کا سودائی ہے

لیکن اب مشکل ہے ان کا سانس بھی لینا یہاں
حق کی خاطر ہم کھڑے ہیں لیکے شمشیر و سناں

اب ہر اک حق دار کا حق اس کو ہم دلوائیں گے   بھوک اور افلاس کا نام و نشاں مٹوائیں گے
لوٹنے والوں کو ہم ماریں گے یا مر جائیں گے   مثلِ طوفاں قصرِ عالیشان سے ٹکرائیں گے

ایک اِک ظالم سے لیکر ہم رہیں گے انتقام
دفن کر دیں گے منوں مٹی میں موجودہ نظام

وہ نظامِ فتنہ ساماں جو سراپا درد ہے   جس میں آلام و مصائب میں گھرا ہر فرد ہے
جس میں انفاسِ مسلسل کی حرارت سرد ہے   جس میں خلق اللہ کا لب خشک چہرہ زرد ہے

وہ نظامِ کہنہ ہم بدلیں گے اب تیری قسم
اِنقلابِ نو کی جانب اُٹھ چکے اپنے قدم

ہاں، یہاں پر آج تجھ سے عہد اک کرتے چلیں   تیرے قاتل بھی اگر چاہیں تو یہ جملے سُنیں
وقتِ آئندہ میں ایک اِک کی اڑیں گی گردنیں   مجرموں کی "قاتلوں کی" ذہن میں ہیں صورتیں

خونِ ناحق کا ترے لینا ہے اِک اِک سے حساب
زندگی کو تیری ہم سمجھیں گے قانونی کتاب

ہاں نظر میں ہے ہماری قلعۂ لاہور بھی   اگلے وقتوں میں کبھی، جو تھا شبستانِ شہی
جس کا ذرہ ذرہ کہتا ہے بفضلِ آگہی   مقتلِ ناصر یہی ہے، مقتلِ ناصر یہی

دوستو آگے بڑھو غارِ مظالم پاٹ دیں
گردنوں پر جن کی ہے ناصر کا خوں وہ کاٹ دیں

اُن کی گرفتاری پر خبر لگائی گئی :

"چالیس ناموں والا کمیونسٹ گرفتار کر لیا گیا"

حسن ناصر خودکشی نہیں کرسکتا، وہ تو نئی زندگی کا پیامبر تھا

رفیق چوہدری

پاکستان کی تاریخ میں حسن ناصر شہید ہی وہ واحد شخصیت ہیں جس کا اثر بائیں بازو کے تمام عناصر پر ہے وہ مزدور کسان پارٹی ہو، یا کسی مل، فیکٹری، ورکشاپ، کالج سرکاری نیم سرکاری، غیر سرکاری اداروں کی یونین یا سیاست کے پلیٹ فارم پر آپس میں گتھم گتھا سیاسی پارٹیاں سب کا ہیرو، سب کا آئیڈیل حسن ناصر شہید ہے۔

پچھلے برس یعنی ۱۹۷۰ء میں ان کی دسویں برسی منائی گئی بائیں بازو کی مختلف تنظیموں نے علیحدہ علیحدہ جلسے منعقد کرکے عقیدتوں کے پھول نچھاور کئے، ان کے ارفع و اعلٰے اصولوں پر چلنے کا عہد کیا۔ جن کی بقا و دوام کے لئے شہید نے اپنی جان ظلم و تشدد کے دیو کی بھینٹ چڑھا دی حسن ناصر جس مقصد جس نصب العین کی خاطر بربریت کا نشانہ بنے وہ کوئی ڈھکے چھپے راز نہ تھے نہ ان کے پروگرام میں کوئی سازش کار فرما تھی اور نہ ہی کسی اسلحہ ساز فیکٹری کا نقشہ ان کے زیر غور تھا۔ ان کے پاس تو صرف ایک ایسا ذہن اور دل تھا جو صرف غریبوں کے لئے سوچتا اور غریبوں کا غم خوار تھا، وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے مگر جب انہوں نے اس پرخار وادی میں قدم رکھا تو جاننے والے جانتے ہیں کہ پھر ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئی۔ انہوں نے غریبوں کے ساتھ رہ کر ان کے سارے دکھوں، غموں اور محرومیوں کو جانا جن سے ان کا دن رات کا واسطہ ہوتا تھا۔ وہ اپنی ذات کو بھول کر مفلس اور قلاش لوگوں کے ساتھ وابستہ ہو گئے پھر ان کے ساتھ مل کر دنیا کے لٹیروں اور غاصبوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے بکھرے ہوئے بے بس و بے کس لوگوں نے متحد ہو کر اپنے حقوق طلب کرنے شروع کر دیئے۔ حسن ناصر شہید کا صرف اور صرف یہی قصور تھا جس کی پاداش میں ان پر بے پناہ مظالم توڑے گئے۔ یہاں تک کہ ظلم کے دیو نے غریبوں اور مفلسوں کی آہ پر تڑپ اٹھنے والے دل کو ہمیشہ کے لئے مسل ڈالا قلعہ لاہور کی وہ کوٹھری

ماں نے لاش دیکھ کر کہا :

"یہ ڈیل ڈول'

یہ بازو'

یہ قد کاٹھ'

میرے بیٹے کا نہیں"

جس میں انہیں رکھا گیا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد اس میں فرش سے چھ فٹ کی اونچائی پر ایک کیل ٹھونک کر اس سے آزار بند باندھ دیا گیا۔ اور کہا گیا کہ اس سے لٹک کر حسن ناصر نے خودکشی کر لی ہے کتنی ستم ظریفی کی بات ہے۔ کہ ایک تابناک مستقبل کی نوید دینے والا مایوسیوں محرومیوں اور دکھوں میں گھرے ہوئے زندگی سے اکتائے ہوئے انسانوں کو درخشاں اور پربہار زندگی کا پیغام دینے والا خود اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں کیسے ختم کر سکتا ہے؟

ظلم و جبر کی تاریخ میں پنجاب پولیس کی اس بھونڈی اور گھٹیا حرکت کی مثال ملنا مشکل ہے۔ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ چھ فٹ دو انچ کا کڑیل جوان پانچ فٹ اونچی دیوار میں گڑے چار انچ کے کیل کے ساتھ لٹک کر کیونکر خودکشی کر سکتا ہے سابق میجر محمد اسحاق کی درخواست پر جب ہائی کورٹ نے شہید کی قبر کھود کر نکالنے کا حکم دیا۔ تو حسن ناصر شہید کی والدہ محترمہ نے قبر سے نکالی گئی لاش کو دیکھ کر اسے اپنے بیٹے کی لاش ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا "میں ماں ہوں، میں کسی اور نصیبوں جلی ماں کے بے گناہ بیٹے کی لاش کو اپنا بیٹا کیونکر مان لوں یہ دانت وہ نہیں ہیں جن پر میرے بوسے نچھاور ہوتے رہے ہیں یہ بال وہ نہیں ہیں جن کو میں پہروں سہلایا کرتی تھی یہ ڈیل ڈول، یہ بازو یہ قد کاٹھ میرے بیٹے کا نہیں، میرا بیٹا تو چھ فٹ دو انچ کا تھا۔ میری ممتا نہیں مانتی، میرے سینے کی ہلچل کا اندازہ وہ نہیں جو ایک ممتا کی ماری کا اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھ کر ہونا چاہیئے وہاں موجود تمام ساتھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ پولیس نے اپنے اس گھناؤنے جرم کی پردہ پوشی کے لئے پانچ فٹ پر گاڑے گئے کیل سے لٹک کر خودکشی کے ناکردہ فعل کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں کسی دوسرے پانچ فٹ قد کے جوان کو اس قبر میں اتار دیا ہے۔

حسن ناصر کی گرفتاری کی خبر جس انداز میں شائع ہوئی وہ لوگوں کو آج بھی یاد ہے روزنامہ "جنگ" کے پہلے صفحے پر چوکھٹے میں یہ خبر لگی تھی "چالیس ناموں والا

وہ جیل میں آموں کی کیریاں حاصل کرنے کے لیے درختوں پر چڑھ جاتے تھے

مشہور کمیونسٹ حسن ناصر گرفتار کر لیا گیا" اس قسم کی سنسنی خیز خبروں نے حسن ناصر کی اصل شخصیت کو چھپا کر اسے پُراسرار رومانٹک اور کسی حد تک ڈراؤنی بھی بنا دیا میرے جاننے والوں میں ایک صاحب ایسے ہیں جو آج بھی بانگِ دہل قسم کھا کر بتایا کرتے ہیں کہ حسن ناصر سے بڑھ کر بہروپ بدلنے والا میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ "میں نے ایک دن انہیں لارنس روڈ پر پٹھان کا روپ دھارے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور ایک طرف کو چل دیئے۔ میں نے ان کا پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ پھر اسی دن دوپہر کو میں پاکستان چوک میں کھڑا تھا کہ اچانک میری نظر ایک کبڑے سے آدمی پر پڑی جو بھکاریوں کے سے پھٹے پرانے کپڑے پہنے بڑے پُر اسرار انداز میں تاک جھانک کرتا جا رہا تھا میں نے فوراً پہچان لیا۔ پھر حد ہو گئی۔ اسی شام صدر میں میرے نزدیک سے ہو کر ایک "گجراتی سیٹھ" ایک ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ اس نے اچانک میری طرف گھور کے دیکھا میں چونک اٹھا ٹیکسی فریئر روڈ کی طرف چلی گئی میں نے کہا جا بچے عیش کر" بعض لوگ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر ایسے ایسے افسانے تراشتے ہیں جن کا نہ کوئی سر ہوتا ہے نہ پیر مگر اچھے بھلے آدمی کو ایسے لوگ اپنی اہمیت جتانے کی خواہش کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بیشتر اوقات لوگوں نے اچھے اور نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے لباس اور روپ بھی بدلے مگر یوں بھی نہیں کہ اچھا بھلا آدمی بہروپیا ہی بن گیا حسن ناصر شہید کو ہم نے کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ جس سے ان کی شخصیت مسخ ہوتی ہو۔ جب وہ گرفتار ہوئے ہیں تو اس وقت بھی وہ وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے جو وہ عام طور پر پہنا کرتے تھے وہ نہ تو مافوق الفطرت عادات کے مالک تھے اور نہ ہی کسی فلمی ہیرو کی طرح چٹ پٹے مصالحہ دار تھے۔ سیدھے سادھے انسانوں کے خصائل ان میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ غربت کی چکی میں پیسے اور افلاس کے ستائے ہوئے لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہوئے اس جوانِ رعنا کے مضبوط پیکر میں سنجیدگی در آئی تھی گذرتا ہوا ہر لمحہ انہیں زمانے پر چھائی ہوئی ظلمت کا پردہ چاک کر کے روشنی کی کرنوں کا نور پھیلانے پر اکساتا رہتا وہ زندگی کے اس سے کشید کی ہوئی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے لطف اندوز ہونا بھی جانتے تھے سبط صاحب کا کہنا ہے کہ "وہ جیل میں آموں کی کیریاں حاصل کرنے کے لئے بالکل بچوں کی سی حرکات کیا کرتا تھا۔ آموں کے درختوں پر چڑھ کر کیریاں توڑتا اور بہت خوش ہوتا تھا"۔

ہم نے انہیں بچوں کے ساتھ کھیلتے گھاس پر لوٹنیں لگاتے گھوڑا بنتے، بچوں کے ساتھ مل کر مونہہ چڑاتے تالیاں بجاتے اور کد کڑے لگاتے بھی دیکھا ہے۔ وہ دوستوں سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ ان کے روزمرہ کے کاموں میں دلچسپی لیتے ان کی کامیابی، ناکامی، خوشی اور غمی میں شرکت کرتے ان کے دوستوں کا حلقہ محدود تھا، انہی لوگوں کے وہ قریب تھے۔ جو ایک واضح نظریۂ حیات پر یقین رکھتے تھے۔ وہ نظریۂ حیات جو لوٹ کھسوٹ، ظلم و تشدد اور دوسرے بہیمانہ ذرائع کے خلاف سینہ سپر ہونا سکھاتا ہے۔ انسانیت کے خلاف ہونے والی تہہ مانی مقامی و بین الاقوامی سازشوں کا پردہ چاک کر کے پُرامن بقائے باہمی کا درس دیتا ہے دوستوں کا محدود حلقہ رکھنے والا حسن ناصر آج ہم میں نہیں ہے مگر انسان کے لئے اس کی لامحدود اور لازوال محبت کا نقش آج ہر انسان دوست کے دل پر ثبت ہے کسی مقصد یا نظریہ کی خاطر جان کی بازی لگا دینے کی باتیں کرنے والوں کی کمی کسی دور میں بھی نہیں رہی مگر سچ مچ اپنے اصولوں کی خاطر جان وار دینا اتنا آسان نہیں۔ وہ کون سا لالچ تھا۔ جو شہید کو نہیں دیا گیا۔ بہت اونچے گھرانے کی حسین و جمیل لڑکی سے شادی جو اپنے ساتھ ملیں، اور خزانے لے کر آتی۔ اعلیٰ تعلیم یا اس کے بہانے عیاشی کی غرض سے کسی بھی ملک کو سوائے سوشلسٹ ملکوں کے منتخب کرنے کی پیش کش اس کے علاوہ انہیں نام نہاد ثقافتی تقریبات اور ایسی دیگر جگمگاتی فروعات سے متاثر کرنے کی بارہا کوشش کی گئی۔ مگر وہ انسانیت کا پرچارک وہ دکھیوں کا ساتھی کسی فریب میں نہ آیا۔ وہ ہر بار اونچے ایوانوں اور جگمگ کرتی روشنیوں کو حقارت سے ٹھکرا کر اپنے دکھی اور انسان دوست ساتھیوں کے پاس چلا آیا انہوں نے کبھی بھی ساتھیوں کے اعتماد کو نہیں جھٹلایا۔ وہ کٹھالی میں تپا ہوا کندن تھا اس نے کڑی سے کڑی کسوٹی پر وہ چمک پیدا کی کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور وہ آخری کسوٹی جس پر اس کندن کی چمک دمک ابدی ہو گئی ہے جو رہتی دنیا تک ظلمت کے پردوں کو چاک کرتی رہے گی۔ ایک روشن خنجر کی طرح اندھیرے

"دیکھ! تیرا شاندار دوست آ گیا"

میں ان دنوں گارڈن ایسٹ کے علاقہ میں رہتا تھا۔ ایک بنگلے کا کچھ حصہ میرے پاس تھا۔ بنگلے کا وسیع گھاس کا لان اور باغیچہ مشترکہ طور پر استعمال ہوتے تھے۔ مگر زیادہ تر ہم لوگوں کا ہی اس پر قبضہ رہتا تھا۔ جب ہم گھر میں ہوتے تو ہمارے دوستوں کی محفلیں یہیں جمتی تھیں۔ حسن ناصر جب بھی آتے باغیچہ کی مٹی میں لت پت میرے بچوں کو اٹھا لیتے اور گھاس کے لان میں آ کر ان سے کھیلنے لگ جاتے بنگلے کے برآمدے میں لٹکے جھولے میں بیٹھی بنگلہ کی مالکہ جھولا جھولتی ہوئی مجھے زور زور سے آوازیں دینے لگتی۔ "چوہدری! چوہدری بیٹا! تیرا شاندار دوست آیا ہے"۔ مجھے فوراً پتہ چل جاتا کہ کون آیا ہے۔ اس بڑھیا کے نزدیک بھی اگر کوئی اس دنیا میں شاندار آدمی تھا تو وہ حسن ناصر تھا۔ حسن ناصر اس بڑھیا کو جسے ہم اماں کہا کرتے تھے۔ دور سے سلام کرتے، اماں انہیں دعائیں دیتی۔ اور آہستہ سے مجھے کہتی "بیٹا یہ ہے چریا (پاگل) دیکھ تو کیسے ستھرے کپڑے پہنتا ہے اور گندے بچوں کو کیسے گود میں لئے بیٹھا ہے۔ چریا ہے بالکل چریا" پھر کبھی کبھی جھنجھلا کر حسن ناصر سے بھی کہہ دیتی اور مجھے بھی ڈانٹ دیتی۔ کہ "ایسے شاندار آدمی کے پاس بچوں کو نہلا کر نئے کپڑے پہنا کر ہی آنے دینا چاہیئے"۔ حسن ناصر ہنستے اور اسی طرح بچوں کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ یہاں تک کہ دوسرے دوست آ جاتے اور بڑوں کی محفل جم جاتی۔

کے سینے میں اترتی رہے گی۔ ان کی اس قربانی نے بہت سارے ساتھیوں کو جیل کی تاریک کوٹھریوں میں ظلم و تشدد کا نشانہ بننے سے بچا لیا۔ حسن ناصر نے اپنی جان دے کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو کس قدر عزیز رکھتے تھے۔ ورنہ ہم تو ایسے نام نہاد "انسان دوستوں" کو بھی جانتے ہیں جن کو حکومت وقت کی کسی غلط فہمی کی بنا پر گرفتاری کے بعد ہمیشہ یہ قلق رہا کہ ہم تو گرفتار ہوئے مگر فلاں، فلاں جو زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے تھے، گرفتار کیوں نہ ہوئے۔ خیر یہ تو ہوتا ہی ہے۔ چڑھی ہوئی تیز رو ندی اپنے ساتھ خس و خاشاک کو بھی بہا لے جاتی ہے۔

مزدوروں اور کسانوں کے لئے حسن ناصر شہید ابھرتے ہوئے سورج کی مانند ہیں، جس کی روشنی میں وہ اپنے مستقبل کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ شہید کی ہمت، عزم استقلال قائم قدم پر جدوجہد کی راہیں استوار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ہشت نگر سے کراچی تک کے مزدور کسان، طالب علم، نچلے متوسط کے کلرک، تاجر، دانشور غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ جن کے دم قدم سے کاروبار زندگی میں چہل پہل ہے۔ جن کے قوت بازو اور ذہن رسا پر ہی اس نظام رنگ و بو کا انحصار ہے ان کے سامنے حسن ناصر کی شخصیت اور اس کی شہادت کے اسباب واضح تر ہوتے جا رہے ہیں۔

کروڑوں انسانوں کی محنت کے پھل کو چند عیار و جابر لوگ سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ یہ کیسی اندھیر نگری ہے! حسن ناصر نے اس محنت کی لوٹ کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور پھر اس شدت کے ساتھ محنت کش طبقے کو اپنے جائز حقوق کی حفاظت کی خاطر محنت کی لوٹ سے بچنے کی خاطر متحد کرنا شروع کر دیا اور اپنی زندگی ان کے لئے وقف کر دی۔ ان کے نزدیک اونچے ایوان، حسین و جمیل دوشیزائیں اور بیرونی ممالک کی عیاش بھری اعلیٰ تعلیم سب چیزیں حقیر اور فضول تھیں، ان کا حساس ذہن اور درد بھرا دل ان فضولیات کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ آخر اونچے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا، عزت مآبوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں اور نتیجتاً حسن ناصر کو انسان دوستی کی پاداش میں ظلمت و جبروت کے نشان قلعہ لاہور میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد تاریخ اس وقت ورق الٹتی ہے۔ جب انہیں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا گیا۔ آج پھر ایک اور حسن ناصر قلعہ بند ہوا ہے سابق میجر محمد اسحاق جس نے اپنے پیش رو پر ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کر کے پولیس کے گھناؤنے کردار سے پردے ہٹا کر پولیس کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا تھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق آج وہی میجر محمد اسحاق اسی قلعہ کی دیواروں کے پیچھے چلا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہی کوٹھڑی نمبر ۱۳ ہو اور پوچھ گچھ کے طریقے بھی وہی۔

اختر کاظمی

قلعۂ لاہور سے

اے قلعۂ لاہور کی جانسوز فضاؤ
یہ کس کا جنازہ ہے ذرا ہم کو بتاؤ

اس رازِ نہاں سے کوئی پردہ تو اٹھاؤ
ہم گوش بر آواز ہیں کچھ لب تو ہلاؤ

تابوت لئے آتے ہیں کیوں اہل وطن آج!
کس واسطے درکار ہیں کافور و کفن آج

کیا بات ہے کیوں آج سسکتی ہیں ہوائیں
کیوں نوحہ کناں آج ہیں پُر درد فضائیں

کیوں آج برستی نہیں مغموم گھٹائیں
کہہ دو کہ یہاں جشن ہے نوحہ نہ سنائیں

پھر آج ہوئی جیت یہاں ظلم کی یارو
ہاں کاکلِ ظلمت کو ذرا اور سنوارو

کہدو کہ یہاں نام نہ لے کوئی وفا کا
کہدو کہ یہاں نام نہ لے کوئی خدا کا!

کہدو کہ یہاں راج ہے ظلمت کی ہوا کا
کہدو کہ یہاں راج ہے بس جور و جفا کا

یہ سوز کی دنیا ہے یہاں ساز نہیں ہے
خاموشی ہے سناٹا ہے آواز نہیں ہے



درسگاہوں میں گنجائش سے زیادہ طالب علم ـــــ اور ایک مجبور اُستاد

زبیر حسین

اعلیٰ تعلیم

ثانوی انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کالجوں کی کل تعداد ۱۹۶۷ء میں ۱۹۵۲ء کے مقابلے میں تین گنا بڑھی لیکن طلباء کی تعداد میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ حکومت کی شائع کردہ کتاب "پاکستان کے بیس سال" کے مطابق کالجوں کی تعداد میں اضافہ ابتدائی و ثانوی درجوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ کالجوں میں حالت یہ ہے کہ سو ڈیڑھ سو طالب علم ایک درجے میں بیٹھتے ہیں اور ان کو ایک استاد تعلیم دیتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ درسگاہوں میں گنجائش سے زیادہ طالب علم اور پھر ایک مجبور استاد! کل پاکستان میں ساڑھے چار سو کے قریب کالج ہیں، جن میں سے صرف دو سو ڈگری کالج ہیں۔ ان کالجوں میں ۶۵ فی صدی سے زیادہ نجی ادارے ہیں جن کو اگر تجارتی ادارے کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کا اعتراف خود حکومت کی شائع کردہ تعلیمی رپورٹوں میں بھی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی آبادی کا صرف اعشاریہ چھ فی صدی گریجویٹس ہیں اور کل آبادی کا صرف اعشاریہ دو فی صدی یعنی پانچ ہزار افراد میں سے صرف ایک ایسا خوش بخت ہے جو کہ گریجویشن تک تعلیم حاصل کر سکا ہے۔

جہاں تک یونیورسٹیوں کا تعلق ہے ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان نے برطانوی سامراج سے گلوخلاصی حاصل کی تو اس وقت پاکستان میں دو یونیورسٹیاں قائم تھیں جو کہ برصغیر ہند و پاک کی بہت پرانی یونیورسٹیاں ہیں اور ایک آزادی سے کچھ عرصے قبل ہی سندھ یونیورسٹی کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ یعنی کل تین یونیورسٹیاں "آزادی" کے وقت ہمارے ملک میں موجود تھیں۔ تئیس سال سے زیادہ عرصے میں اب ہمارے یہاں کل بارہ یونیورسٹیاں ہیں ان بارہ یونیورسٹیوں میں سے دو میں انجنیئرنگ اور تکنیکی تعلیم اور دو میں زراعت کی تعلیم دی جاتی ہے ان یونیورسٹیوں میں داخل ہونے یا رجسٹر ہونے والے طلباء کی تعداد میں اضافہ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجوں کے طلباء کی تعداد میں اضافہ کی نسبت زیادہ ہے طلبا کی تعداد میں اضافہ دس گنا ہوا جب کہ یونیورسٹیوں کی تعداد پہلے سے چار گنا ہو گئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونیورسٹیاں طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔

تکنیکی تعلیم۔

موجودہ عہد میں تکنیکی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہر باشعور اور ذی ہوش شخص کو ہے۔ آج کے ترقی یافتہ عہد میں کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے یہاں تکنیکی ماہرین نہ ہوں لیکن ہمارے یہاں کے ارباب حل و عقد کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جس کا اندازہ ۱۹۶۷ء تک کے بیس سالوں کے اعدادی جائزہ سے ہوتا ہے۔

۱۹۵۰ء میں پاکستان میں دو انجنیئرنگ اسکول اور ایک سو چودہ صنعتی تکنیکی اور پولی ٹیکنک اسکول کا اضافہ ہوا جب کہ ۱۹۶۳ء میں مغربی پاکستان کے واحد انجنیئرنگ اسکول کو بند کر دیا گیا۔ اس طرح ۱۹۶۶ء میں کل پاکستان میں انجنیئرنگ اسکولوں کی تعداد دو ہی رہی۔ صنعتی تکنیکی اور پولی ٹیکنک اسکول ایک سو چودہ سے گھٹ کر ۱۹۶۶ء میں بتیس رہ گئے۔ ۱۹۶۰ء میں پولی ٹیکنک اسکولوں کو صنعتی و تکنیکی اسکولوں سے علیحدہ حیثیت دی گئی ۱۹۶۶ء تک ملک میں انتیس پولی ٹیکنک معہ پرانے اسکولوں کے قائم ہو گئے جن میں سے مغربی پاکستان میں انیس اور مشرقی پاکستان میں جس کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ ہے دس اسکول قائم کیے گئے۔ جب کہ ۱۹۵۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق کل ایک سو چودہ صنعتی و تکنیکی اسکولوں میں سے مشرقی بازو میں تہتر اسکول تھے جو ملک کی نام نہاد صنعتی تجارتی اور زراعتی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ روز بروز کم ہوتے گئے ملک میں عام طور پر صنعتی، تکنیکی اور انجنیئرنگ اسکولوں کی تعداد کے مقابلے میں ۱۹۶۶ء میں کافی حد تک کم ہو گئی۔

انجنیئرنگ اور سروے کے اسکولوں میں ۱۹۵۰ء میں طلباء کی تعداد چھ سو انیس تھی جو ۱۹۶۰ء میں جا کر صرف ایک سو رہ گئی۔ مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۰ء میں ان اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد اناسی تھی جو بڑھ کر ایک سو ایک ہوئی جب کہ مغربی پاکستان میں ۱۹۵۰ء میں ان اسکولوں میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد پانچ سو چالیس تھی ۱۹۶۳ء میں حکومت کے بروقت فیصلے کے تحت مغربی پاکستان میں اس درجے میں تکنیکی تعلیم کو یکسر ختم کر دیا گیا۔

۱۹۵۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق صنعتی اسکولوں میں طلبا کی تعداد پانچ ہزار اڑسٹھ تھی ۱۹۶۶ء میں طلباء ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں کم ہو کر چار ہزار آٹھ سو چوہتر رہ گئے۔ صنعتی و تکنیکی اسکولوں کی تعداد میں روز بروز کمی کے ساتھ ہی ساتھ ان اداروں میں طلبا کی تعداد میں

۵ ہزار افراد میں سے صرف ایک شخص ڈگری تک تعلیم حاصل کرتا ہے

بھی نمایاں فرق پیدا ہوا۔

پولی ٹیکنک تعلیمی اداروں میں سنہ ۱۹۶۱ء میں ساڑھے تین ہزار کے قریب طالب علموں نے تعلیم حاصل کرنی شروع کی جو سنہ ۱۹۶۶ء میں بڑھ کر تین گنا ہو گئے۔ مشرقی پاکستان میں سنہ ۱۹۶۱ء میں ساڑھے سات سو طالب علم تھے جو ۱۹۶۶ء میں بڑھ کر دو ہزار دو سو تنتالیس ہو گئے "اندازاً" تین گنا اضافہ ہوا مغربی پاکستان میں طلبا کی تعداد میں اضافہ کی رفتار بھی تقریباً یہی رہی لیں دونوں حصوں میں اتنا امتیاز برتا گیا کہ سنہ ۱۹۶۱ء میں مشرقی پاکستان کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں کچھ اس طرح انتظام کیا گیا کہ یہاں طالب علموں کی تعداد اس حصے کی نسبت تین گنا تھی جو ۱۹۶۶ء میں بھی برقرار رہی۔

جہاں تک اعلیٰ درجات میں تکنیکی تعلیم کا مسئلہ ہے سنہ ۱۹۵۳ء میں انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کالجوں کی تعداد کل چار تھی جو تیرہ سال بعد یعنی سنہ ۱۹۶۶ء میں بڑھ کر پانچ ہو گئی یعنی تیرہ سال کے عرصے میں ایک انجینئرنگ کالج کا اضافہ ہوا اس کی قیمت جو ہمیں دینی پڑی وہ واضح کی جا چکی ہے کہ ثانوی درجوں میں اس تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ بہرحال مشرقی پاکستان میں سنہ ۱۹۵۳ء میں اعداد و شمار کے مطابق صرف ایک انجینئرنگ کالج تھا جو کافی لمبے عرصے کے بعد بھی ۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق صرف ایک ہی رہا۔ مغربی پاکستان میں یہ تعداد تین سے بڑھ کر چار ہو گئی۔ انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی حکومت کا یہ منفی اقدام آج تک کسی ملک میں شاید وقوع پذیر نہ ہوا ہو گا۔

ان چند گنے چنے انجینئرنگ کالجوں میں طالبعلموں کی تعداد ۱۹۶۶ء میں بڑھ کر تقریباً دگنا رہی مشرقی پاکستان میں ۱۹۶۶ء میں طلبا کی تعداد ۱۹۵۳ء کے مقابلے میں نصف سے بھی کم ہو گئی جب کہ مغربی پاکستان میں اضافہ کی شرح ۱۹۵۳ء کے مقابلے میں دگنا سے کچھ زیادہ رہی۔ یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ ملک کے دو حصوں میں تعلیم کی ترقی میں فرق کسی پالیسی یا سازش کا نتیجہ ہے۔؟

جاگیردارانہ وسرمایہ دارانہ مفادات کا تحفظ کرنے والی مختلف حکومتوں نے جو اس دوران ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لئے رہی۔ یہ کرم کیا ہے کہ ڈھاکہ اور لاہور میں ایک ایک انجینئرنگ یونیورسٹی قائم کر دی جس میں ۱۹۶۶ء کے حکومتی اعداد و شمار کے مطابق سوا تین ہزار طالب علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اب تین چار سال بعد یقیناً اس میں تھوڑا سا اضافہ ہوا ہی ہو گا۔

زراعتی تعلیم

ملک بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے جس کی کل قومی آمدنی کا بڑا حصہ زراعت کے میدان سے حاصل ہوتا ہے ملک کی ۸۰ فی صد آبادی کی زندگی کا انحصار و دارومدار بھی زراعت پر ہی ہے کیونکہ ہماری آبادی کا بڑا حصہ گاؤں اور دیہاتوں میں ہے کسی بھی ملک کی صنعتی ترقی کی اہمیت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن زراعت کو نظر انداز کرنا بڑی بدقسمتی کا ثبوت ہے۔ ہمارے ملک میں کوشش بھی یہی رہی کہ زراعت کی قربانی سے صنعت کو ترقی دی جائے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ صنعت زراعت کی ترقی کا باعث بنے۔ ہماری معیشت کی بنیاد ہی زراعت ہے۔ اسی لئے زراعت کو سائنسی اصولوں پر ڈھالنے کے لئے اور پتھر کے زمانے کے اوزار اور آلات پیداوار کی جگہ نئی نئی سائنسی دریافتوں و ایجادات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے جو بغیر تعلیم اور بالخصوص زرعی تعلیم کے ناممکن ہے۔

اس نکتہ نظر سے ملک میں زرعی تعلیم کی اہمیت ایک ناقابل تردید حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان جیسے زرعی ملک میں زراعت کی تعلیم کو زیادہ فروغ حاصل ہوتا تا کہ پاکستان میں کاشتکاری کو سائنسی اصولوں کی بنیاد پر نئے قالب میں ڈھالا جا سکے اور زیادہ پیداوار کم محنت کو عملی شکل دی جا سکے۔ کیمیاوی کھاد کے استعمال سے زمین کی قوت پیداوار بڑھائی جائے اور سیم و تھور جیسے خطرات کے خلاف سائنسی ایجادات کا استعمال کیا جا سکے اور زراعت میں نئی نئی مشینی ایجادات کے ذریعے ایک انقلابی تبدیلی پیدا کی جائے۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق مشرقی پاکستان میں زرعی تعلیم کے لئے دو اسکول تھے جب کہ مغربی پاکستان میں ایسی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا مشرقی پاکستان میں ان اسکولوں کی تعداد بڑھ کر چار ہو گئی لیکن مغربی پاکستان میں ایک بھی اسکول قائم نہ کیا گیا ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان میں کوئی زرعی کالج نہ تھا لیکن ۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق تیرہ سال کے عرصے میں ایک زرعی کالج قائم کیا گیا، اس کے برعکس مغربی پاکستان میں تین زرعی کالج قائم تھے سنہ ۱۹۵۳ء اور سنہ ۱۹۶۶ء کے دوران ان تین زرعی کالجوں میں سے ایک کو بند کر دیا گیا۔

بہرحال حکومت کے نئے اعداد و شمار کے مطابق اب ملک میں چار زرعی اسکول اور پانچ زرعی کالج قائم ہو چکے ہیں ۱۹۶۱ء میں مشرقی و مغربی پاکستان میں ایک ایک زرعی یونیورسٹی بھی قائم کی گئی ہے۔

میڈیکل کی تعلیم:۔

حکومت کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی سالوں تک تو اسکولوں میں بھی طلبا کو کسی حد تک میڈیکل تعلیم دینے کا رواج ضرور تھا یا یونہی ازراہ تفریح تھا لیکن حکومت کے ماہرین تعلیم نے یہ مناسب سمجھا کہ ان اسکولوں کو بند کر دیا جائے اس لئے ان پانچ اسکولوں کو جو ۱۹۵۰ء میں مشرقی پاکستان میں قائم تھے ۱۹۶۳ء میں بند کر دیا گیا۔ مغربی پاکستان میں اس نوع کا ایک اسکول ۱۹۵۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ جو ۱۹۶۳ء میں بند کر دیا گیا۔

جہاں تک حکومت کی نظروں میں میڈیکل تعلیم کی اہمیت کا سوال ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک پاکستان میں چار میڈیکل کالج قائم تھے ۱۹۵۳ء میں ان کی تعداد سات ہوئی اور اب پورے پاکستان میں بارہ میڈیکل کالج ہیں ۱۹۵۳ء میں میڈیکل کالجوں میں طلبا کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی جو ۱۹۶۶ء میں بڑھ کر سات ہزار کے قریب ہو گئی اور اب ان کی تعداد آٹھ نو ہزار ہو گی۔

تعلیمی مسائل اور ان کا حل

طبقاتی بنیاد پر تعلیم

ہمارا ملک ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کی دو سو سالہ دور غلامی سے آزاد ہوا لیکن جو آزادی ہمیں تیئس سال پیشتر مسلسل جد و جہد اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی دراصل "گہنائی ہوئی آزادی" تھی آزادی کا دلفریب اور جاذب نظر تصور جو کروڑوں عوام الناس کے ذہن میں موجود تھا، پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ معاشرے کا سیاسی طور پر باشعور حصہ تو شروع دن سے ہی اس

صنعتی، زرعی اور تکنیکی تعلیمی اداروں کی طرف مطلق توجہ نہ دی گئی

دھوکہ فریب اور مکر کی حقیقت سے بہرہ ور ہو چکا تھا لیکن اب ملک کی آبادی کا بڑا حصہ بھی یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم ہزاروں بھائی بہنوں کی قربانیاں دے کر، کروڑوں روپے کی مالیت کی جائیدادیں اور مال و متاع گنوا کر اور ماؤں بہنوں کی عصمتوں کو لٹا کر بھی آزادی کے اس تصور کو تئیس سال بعد بھی نہیں پا سکے جو ملک کی تقسیم سے قبل ہمارے ذہنوں میں روشن تھا۔ بلا مبالغہ ہر گھر کے بزرگ عام طور پر یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ اس "آزادی" سے تو انگریز کا دورِ غلامی بہتر تھا۔

یہ کیسی آزادی ہے کہ آزاد ملک کا فرد دورِ غلامی کو ترجیح دے رہا ہے؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے حسین پردے کے پیچھے تقسیمِ ہند سے قبل حکومت برطانیہ نے اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ کے لئے جو معاشی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی نظام غلام ہندوستان کے لئے تشکیل دیا تھا۔ وہ نظام ہمارے ملک میں آزادی کے تئیس سال بعد بھی جوں کا توں لاگو ہے۔ فرق یہ ہوا کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد اور زار کے روس میں ۱۹۱۷ء کے عظیم اکتوبر انقلاب کے بعد بین الاقوامی سامراج میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ براہِ راست طور پر نوآبادیات کو اپنے قبضہ و قدرت میں رکھتا، پس اس نے اس لوٹ کے نظام کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ایک نیا چولہ بدلا اور بالواسطہ لوٹ کھسوٹ کے نئے تصور یعنی نیم نوآبادیاتی نظام کے تحت اپنے کارندوں یعنی اپنی نوآبادی کے رجعت پسند حلقوں، جاگیرداروں، گماشتہ سرمایہ داروں اور ان کے پالتو دلالوں کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور تھما دی تاکہ دنیا بھر میں سامراج کے خلاف تیزی سے بڑھتی ہوئی قومی آزادی کی تحریکات، جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تحریکات اور سائنسی ترقی سے بڑھتے ہوئے عوامی شعور کی وجہ سے سامراجی نظام کو جو فوری خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ وقتی طور پر اس سے بچا پایا جا سکے اور اس طرح اپنی لازمی موت کو مزید کچھ عرصے کے لئے ٹالا جا سکے۔

چونکہ ملک میں انگریز کا بنایا ہوا معاشی، سیاسی اور سماجی نظام اب بھی جوں کا توں موجود ہے، اسی لئے غلام ہندوستان کے کمتر اور تہذیب و تمدن سے بیگانہ لوگوں کے لئے بنایا ہوا تعلیمی نظام بھی بدستور موجود ہے۔

دراصل معیشت بنیاد ہے، جس پر کسی ملک کی سیاسی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اور سماجی حالات انہی دونوں یعنی معیشت اور سیاست کا پرتو ہوتے ہیں۔ اب تک اس ملک میں سامراجی سرمایہ کی لوٹ کھسوٹ اور جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصال کا نظام رائج ہے جس کے منطقی نتیجے کے طور پر انہی طبقات کے مفادات کا خیال رکھنے والا نظام بھی ملک میں موجود ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک کہ اس ملک کی عوامی طاقتیں پے در پے یلغاروں کے ساتھ جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کر کے عوامی فلاح و بہبود اور بھائی چارہ و مساوات کے نئے ترقی پسند نظام کو نہیں قائم کرتیں۔

منافع کی بنیاد پر مرتب کئے ہوئے اس نظام سے آج ملک کے بارہ کروڑ عوام بشمول طالب علم برادری سخت مشکلات و مصائب کا شکار ہیں۔ غربت و افلاس، بھوک و بیماری، بے روزگاری اور جہالت کے خوفناک اندھیرے ملک کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ ہر فرد اپنے ماضی سے بیزار، حال سے غیر مطمئن اور مستقبل کے لئے فکرمند ہے۔ چور بازاری، رشوت خوری، اقربا پروری

طبقاتی معاشرے میں طبقاتی نظامِ تعلیم نافذ کر دیا گیا

لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری، لوٹ مار، منافع خوری عصمت فروشی اور اخلاقی انحطاط موجودہ سماج کی دین ہے۔

طالب علم برادری چونکہ انہی مختلف مسائل سے دوچار کروڑوں محنت کش عوام کے فرزند ہیں۔ اس لئے اُن کے مسائل، مصائب و مشکلات اور درد و تکلیف بھی وہی ہے جن سے اُن کے والدین دوچار ہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر عوام کے معاشی مسائل کو حل کر دیا جائے تو طالب علم برادری کے تمام بڑے مسائل جو کہ بنیادی طور پر ان کے ابتر معاشی حالات کے پیداوار ہیں۔ یقیناً حل ہو جائیں گے۔

ملک کے محنت کش عوام کی طرح طالب علم برادری بھی غربت و افلاس، بے روزگاری اور مہنگائی کا شکار ہے۔ چونکہ درسی کتابوں کی مہنگائی اور کمیابی، فیسوں کی زیادتی اور آمد و رفت کے خرچ کی زیادتی، صرف اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ معدودے چند طالب علموں کو چھوڑ کر طالب علم برادری کی بہت بڑی اکثریت غریب مفلوک الحال گھرانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں تک دولت مند طبقے سے تعلق رکھنے والے چند طالب علموں کا مسئلہ ہے اُن کے لئے درسی کتابوں کی قیمت اور کمیابی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ہزارہا روپے عیش و عشرت پر خرچ کرنے والوں کو فیسوں کی زیادتی کا احساس کیا ہو سکتا ہے؟ نیلی پیلی کاروں پر تفریح کرنے والوں کے لئے بسوں میں آمد و رفت کا خرچ۔ چہ معنی دارد؟

ملک میں موجود طبقاتی نظام کے اثرات سے بھلا تعلیمی نظام کیوں نہ متاثر ہوتا۔ اس ملک میں دو طرح کے نظام موجود ہیں۔ ایک وہ جو اعلیٰ طبقوں کے لئے ہے۔ دوسرا وہ جو غریب اور مفلس گھرانوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے لئے ہے۔ اس طرح ملک کا تعلیمی نظام بھی طبقاتی ہے۔ دولت مند افراد کے لئے خوبصورت و کشادہ درسگاہیں، کھیل کے میدان، تیراکی کے پول، اچھا فرنیچر اور قابل اساتذہ موجود ہیں۔ ان درسگاہوں میں تربیت حاصل کرنے والے طالب علموں کو حکومت کرنے، ریاستی مشینری کو چلانے اور ملک کے ذرائع و وسائل پر قابض ہونے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری جانب سرکاری درس گاہوں کی نیم پختہ و کچی عمارتوں میں ٹوٹے پھوٹے بنچوں، دریوں اور فرش پر بٹھا کر پھٹے پرانے، میلے کچیلے لباس پہنے ہوئے پریشان حال اساتذہ (جو کہ بیچارے در در کی ٹھوکریں کھا کر اور بے روزگاری سے تنگ آ کر مجبوراً یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں) سینکڑوں بچوں کو چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھرے۔ چیخ و پکار اور دھما چوکڑی کی عجیب سی فضا میں لاکھوں طالب علموں کو "زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ" کرتے ہیں۔ ایسے گندے ماحول میں تربیت حاصل کرنے والے بچوں کا مقابلہ جب پبلک اسکولوں میں تربیت

پانے والے امیرزادوں سے ہوتا ہے تو احساسِ کمتری کا شکار ہو کر لاکھوں نوجوان ذہنی خلفشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ امریکہ و برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک کے بڑے بڑے تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے والے چند دولت مندوں کے سامنے شکستہ در و دیوار والے مدرسوں اسکولوں اور کالجوں سے تربیت یافتہ بچے زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں تو کلرک، بابو، یا منشی بن جاتے ہیں۔ ورنہ زیادہ تر بے روزگار رہتے ہیں۔ جب کہ سرکاری نیم سرکاری اور نجی اداروں میں بڑے بڑے عہدوں پہ ... مال طبقات کے فرزندانِ ارجمند جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ یعنی افسر، مالک اور آقا بننا دولت مندوں کی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے اور آوارہ گردی، بے روزگاری اور زیادہ سے زیادہ کلرک و بابو بننا غریب محنت کش عوام کے بچوں کی قسمت میں ہے۔

قومی ملکیت کا تصور

مندرجہ بالا مفروضات کے علاوہ پبلک اسکولوں اور امدادی درسگاہوں، جن کو حکومت تھوڑی بہت امداد دیتی ہے۔ لیکن زیادہ مصارف وہ افراد خاندان گروہ یا جماعت برداشت کرتی ہیں۔ جنھیں حکومت درسگاہیں قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ گو کہ ان میں نصاب تو حکومت مقرر کرتی ہے اور اس اسکول یا درسگاہ کا تقریباً نصاب بھی وہی ہوتا ہے۔ لیکن اسکول یا درس گاہ کی انتظامیہ کمیٹی اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر دیتی ہے جو سرکاری طور پر نصاب میں داخل نہیں ہوتا۔ مگر اس فرقہ، گروہ یا جماعت کے مفادات سے تعلق رکھتا ہے جس کے ماتحت یہ اسکول یا درسگاہ چلتی ہے۔ مثلاً عیسائی مشن اسکول۔ یوں تو اس میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن ان درس گاہوں میں طالب علموں کے دلوں میں فرقہ وارانہ خیالات طبقاتی اونچ نیچ اور عناد پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اور ان میں مذہبی تعصب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس قومی جذبہ پرورش نہیں پا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ صحیح تعلیمی ترقی اسی وقت شروع ہوتی ہے۔ جب حکومت نے نظام تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہو۔ اس طرح کی تعلیم زندگی کے تمام شعبوں پہ حاوی ہوتی ہے۔ یہ قومی زندگی اور قومی اخلاق کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالتی ہے۔ ہر ترقی یافتہ سماج اور عوامی حکومت میں لازم ہے کہ نظام تعلیم کا ملاً حکومت کے ہاتھ میں ہو۔

قومی ملکیت میں قائم ہونے والے تعلیمی اداروں اور درس گاہوں کے وجود میں آنے سے تعلیم کا ایک نیا نظریہ قائم ہو گیا۔ اس نظام نے ساری فضا بدل دی۔ یورپ میں انقلابِ ذہنیت ۱۴۷۰ء کے بعد شروع ہوا۔ اس کے بعد سے یورپ میں کارخانے قائم ہوئے۔ اقتصادی نظام بدلا اور اس کے بعد زندگی کا سارا نظام بدل گیا۔ انقلابِ فرانس ظہور میں آیا۔ جس کے بعد فرانس میں بورژوائی جمہوریت قائم ہوئی تو لوگوں کی توجہ تعلیمی انقلاب کی طرف مبذول ہوئی۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں یورپ میں نظامِ تعلیم میں تبدیلی شروع ہوئی۔ آسٹریلیا اور جرمنی میں سب سے پہلے قومی تعلیم کا رواج ہوا۔ اس کے بعد فرانس کی باری آئی اور حکومت نے نظام تعلیم اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انگلستان ان سے پیچھے رہا۔ ۱۸۷۰ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے حکومت نے نظام تعلیم کو اپنے اختیار میں لے لیا اور قوم کے تمام بچوں کو تعلیم دینا ریاست کے فرائض میں شامل کیا گیا۔

لیکن اب ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد دنیا کے ایک حصے میں تعلیم کو حقیقی بنیادوں پہ عوام کی ملکیت میں دے دیا گیا ہے مختلف اشتراکی عوامی جمہوری مملکتوں میں عوامی خدمت کے فریضے کے طور پہ طبقاتی بنیاد پر تقسیم کی فرسودہ نظریے کو کاملاً عجائب گھر میں سجانے کی چیز بنا دیا گیا ہے، ساری چیز عوام کی خدمت کے لئے" کے نظریے کی بنیاد پہ ملک کے تمام افراد کو بلا تمیز رنگ، نسل، زبان، ثقافت اور سماجی رتبے کے ایک جیسی تعلیم و تربیت دی جا رہی ہے امریکہ اور اور یورپ کی مختلف مملکتوں میں قومی تعلیم کا تصور بھی طبقاتی بنیاد اپنے دامن میں سمیٹے ہے۔ ان میں دوسری قوموں کی لوٹ کھسوٹ کرنے کی سامراجی حکمت عملی کی کامیابی برتری اور اسے جاری رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

بہر حال ہمارا ملک انقلاب فرانس کے وقت کے فرانس سے اور ۱۸۷۰ء کے برطانیہ سے بھی بہت پیچھے ہے نہ صرف یہاں مختلف گروہ اور خاندان خالصتاً تجارتی بنیادوں پر تعلیمی درسگاہوں کو چلا رہے ہیں بلکہ اس میں انہیں حکومت کی امداد و اعانت بھی حاصل ہے

(باقی آئندہ)

لاہور

این-ایس-او نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں ضم ہو جائیگی

نمائندہ الفتح

گذشتہ دنوں لاہور میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن لاہور، نیشلسٹ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور ینگ پیپلز فرنٹ کے نمائندوں کے ایک مشترکہ اجلاس میں انقلابی نوجوانوں کی ان تنظیموں نے باہمی اشتراک و تعاون کا فیصلہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ رجعت پسندوں، فاشسٹوں اور بائیں بازو کا نام لینے والے موقع پرستوں کی انقلابی قوتوں کے خلاف سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے یہ تینوں تنظیمیں مشترکہ لائحہ عمل طے کریں گی۔ یہ فیصلہ پنجاب کی طالب علم اور انقلابی سیاست میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔ اس اجلاس میں مشرقی پاکستان اور پیپلز پارٹی سے تعاون کے مسئلہ کے موقف کو بھی واضح کیا گیا اور مشرقی پاکستان میں رجعت پسندوں اور فاشسٹوں کی جانب سے خون ریزی کی شدید مذمت کی گئی ایک قرارداد میں کہا گیا کہ مشرقی پاکستان میں موجودہ صورت حال امریکی سامراج اور روسی سوشل سامراج کی رسہ کشی کا نتیجہ ہے اور مشرقی پاکستان کے انقلابی عوام ہر سامراجی سازش کو ناکام بنا کر اپنے حقوق کے حصول میں کامیاب ہو جائیں گے۔ قرارداد میں پیپلز پارٹی کو اقتدار سے محروم کرنے کی کوششوں پر بھی تشویش کا اظہار کیا گیا۔ اور مسٹر بھٹو سے اپیل کی گئی کہ وہ پارٹی کے اندر اور باہر انقلابی قوتوں کو پوری طرح اعتماد میں لیں۔

یہ اجلاس اور اس کے فیصلے دراصل پنجاب کی طالب علم سیاست اور انقلابی حلقوں میں پیدا ہونے والی بعض پیچیدگیوں اور موقع پرستوں کی سازشوں سے پیدا شدہ مسائل کے حل کی کوششوں کا ثمر تھے۔ گذشتہ چند ماہ سے بائیں بازو کا نام لے کر سیاست کی دکان چمکانے والے بعض عناصر این، ایس، ایف میں انتشار کا بیج بونے کی کوشش کر رہے تھے اور تنظیم کے مفاد کے منافی کام کرنے پر بعض افراد کو رکنیت سے خارج کرنے کے بعد ان عناصر نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ ان حلقوں کو رجعت پسندوں اور حکمران طبقے کے علاوہ پیپلز پارٹی کے موقع پرستوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ یہ حلقے این۔ ایس۔ ایف کی بڑھتی ہوئی طاقت اور پیچیدہ صورت حال میں صحیح لائن کے باعث خاصے پریشان تھے۔ اور اس کا زور توڑنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے تھے حسام الحق، جن کو این۔ ایس، ایف سے نکالا جا چکا ہے متوازی تنظیم بنانے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد ان عناصر کے ساتھ مل گئے ہیں۔ دراصل ۲۶ مارچ کے بعد سے مشرقی پاکستان کے مسئلے پر ترقی پسندانہ موقف اختیار کرنے کے باعث مفاد پرست حلقے این۔ ایس۔ ایف کے درپے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں فاشسٹوں کی سرگرمیوں اور عوام پر مظالم کی مخالفت اور مشرقی پاکستان کی انقلابی قوتوں کی حمایت کے باعث نہ صرف این۔ ایس۔ ایف استحصالی طبقوں کا نشانہ ستم بن گئی تھی، بلکہ انقلابی طلباء کے ایک اور گروہ جو این، ایس، او میں شامل تھے، بھی نظروں میں آچکا تھا۔ تاہم اس گروہ کی جڑیں مضبوط تھیں۔ اور کارکن اس کے ساتھ تھے۔ لہذا جلد ہی اس نے این، ایس او کے کارکنوں کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ گذشتہ ماہ کے آغاز میں این۔ ایس، او کے تین اراکین فیاض باقر، مسعود احمد اور حامد جیلانی کو تنظیم کی بنیادی رکنیت سے خارج کر دیا گیا۔ ان افراد پر تنظیم کے مفاد کے منافی کام کرنے اور موقع پرستی کا الزام تھا، ان افراد کے اخراج کے بعد این۔ ایس۔ ایف لاہور اور این، ایس، او میں اشتراک اور تعاون کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور ہو گئیں اور یکساں پروگرام اور موقف کی وجہ سے ان دونوں تنظیموں نے تعاون کا فیصلہ کر لیا۔

اس دوران پیپلز پارٹی سے متعلق چند مفاد پرست اور کاروباری سیاستدانوں نے پنجاب این۔ ایس۔ ایف پر قبضہ جمانے کا پروگرام بنایا۔ اور ایک جعلی تنظیم بنا کر اخباری طور پر اسے استحکام بخشنا چاہا۔ ان سیاستدانوں نے اپنی مقصد براری کے لئے این۔ ایس۔ ایف کے رہنماؤں سہیل ہمایوں، راجہ انور، پرویز رشید اور حبیب اللہ شاکر وغیرہ کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا۔ لیکن ان کی یہ مہم ناکام رہی۔ اور این۔ ایس۔ ایف پنجاب کی تمام شاخوں نے مرکزی تنظیم اور مرکزی صدر ڈاکٹر رشید حسن خان پر مکمل اعتماد کا اظہار کر کے مفاد پرستوں کے منہ بند کر دیئے۔ این۔ ایس۔ او، اور این۔ ایس/ ایف سے خارج شدہ عناصر نے محض بغض و عناد کی بنیاد پر ان دونوں تنظیموں کے خلاف بے سروپا الزام تراشی شروع کر دی جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ان تنظیموں کے رہنماؤں پر غداری کا الزام لگا کر انہیں جیل بھجوانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس طرح ان عناصر کی انقلاب دوستی کے دعوے کا بھرم پوری طرح کھل گیا۔

اس صورت حال کے پیش نظر این، ایس، ایف اور این، ایس، او نے مشترکہ لائحہ عمل تیار کر کے اپنی جدوجہد کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے میں لاہور کے انقلابی اور فعال نوجوانوں کے مضبوط گروہ ینگ پیپلز فرنٹ بھی شریک ہو گیا اور یوں سہ تنظیمی معاہدۂ اشتراک عمل میں آیا۔ انقلابی قوتوں کے اتحاد کے اعلیٰ مقصد کے پیش نظر این، ایس، او کے رہنما بہت جلد ایک کنونشن طلب کر رہے ہیں جس میں تنظیم کے مستقبل کے بارے میں فیصلے کئے جائیں گے۔ توقع ہے کہ اراکین کی بھاری اکثریت این۔ ایس۔ ایف میں ادغام کی حمایت کرے گی۔ اور یوں پنجاب میں این۔ ایس۔ ایف انقلابی طلبا کی واحد اور مضبوط تنظیم کی حیثیت سے ابھرے گی۔ یہ بھی توقع کی جا رہی ہے کہ ینگ پیپلز فرنٹ کے ارکان بھی این۔ ایس۔ ایف میں شامل ہو جائیں گے اور یوں یہ تینوں تنظیمیں متحد اور منظم ہو کر مستقبل کی آزمائشوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گی ان تنظیموں کے اتحاد اور اشتراک سے پنجاب میں انقلابی نوجوانوں کے متحدہ پلیٹ فارم کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے۔ اور امید ہے کہ اس صوبے کے تمام انقلابی نوجوان اس پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں گے۔

شکر گڑھ

آوے ہی آوے

ٹھاہ تے ٹھاہ

گورنمنٹ ڈگری کالج کی انجمن اتحاد طلبا کے انتخابات روایاتی جوش و خروش کی فضا میں ہوئے۔ گذشتہ ایک ہفتے سے طلبا اپنے اپنے امیدواروں کی کنویسنگ میں مصروف تھے اس مرتبہ طلبا واضح طور پر نظریاتی بنیادوں میں دائیں اور بائیں بازو

ہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لئے گذشتہ برسوں کی نسبت اس سال گہما گہمی زیادہ تھی۔ آخری روز طلبا نے اپنے امیدواروں کو جیپ اور تانگوں میں بٹھا کر شہر کے بازاروں میں جلوس نکالا۔ وہ اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق "ووٹ ای آ دے"۔ "فلاں کو ووٹ دو باقی سب کو چھوڑ دو" "پاکستان زندہ باد" اور "بھارت کو کچل دو" کے نعرے لگا رہے تھے۔

ان انتخابات میں سال چہارم کے سراج الحق انجم اپنے مدمقابل مبارک علی سے ۴۸ ووٹ زائد لے کر یونین کے صدر منتخب ہوئے سیکرٹری جنرل کے لئے پرویز عنایت ملک اور محمد پرویز کے درمیان سخت مقابلہ ہوا پرویز عنایت ملک نے آٹھ ووٹ زائد لے کر کامیابی حاصل کی محمد منیر چودھری نائب صدر، اسلم ساجد جائنٹ سیکرٹری محمد توصیف کمال نمائندہ کلاس سال چہارم، عبدالرحمٰن نمائندہ کلاس سال سوم، محمد مقصود احمد نمائندہ کلاس سال دوم سائنس، سیف اللہ نمائندہ کلاس سال دوم آرٹس فرخ امین نمائندہ کلاس سال اول سائنس، رشید حسین نمائندہ کلاس سال اول منتخب ہوئے۔



کنری

آنے پر ٹیکس، جانے پر ٹیکس اور اس کے علاوہ بھی ٹیکس

غازی مختار

جس طرح پاکستان بھر میں حکومت کو میونسپل کمیٹیوں، ٹاؤن کمیٹیوں اور یونین کونسلوں کے عملہ کی نالائقی اور دھاندلیوں کے سبب چنگی ناکے نیلام کرنے پڑے کنری ٹاؤن کمیٹی کے چنگی ناکے بھی اب دوسری بار نیلام ہوئے ہیں پہلی دفعہ کنری کی چنگیوں کا ٹھیکہ سیٹھ محمد یوسف نے تقریباً ۵ لاکھ روپے میں لیا تھا سیٹھ یوسف ایک روایتی سیٹھ ہے جس نے کچھ کاسہ لیسوں کے کان بھرنے پر عملہ میں سے کچھ لوگوں کو ناجائز پریشان کرایا اس میں کچھ ٹاؤن کمیٹی کے مفاد پرست ارکان اور صالح چیرمین وغیرہ سے ٹکراؤ ہوا پھر صالح چیرمین اور بظاہر صالح نہ ہونے کے باوجود صالح اراکین نے کچھ قانونی جواز نکال کر سیٹھ یوسف سے ٹھیکہ چھین لیا حالانکہ ابھی ٹھیکے کے تین ماہ باقی تھے۔

تین مہینے ٹاؤن کمیٹی نے چنگی ناکوں کے ٹیکس کی وصولی خود کی۔ اور پھر جب ٹھیکہ کی نیلامی کا وقت قریب آیا۔ ایک زبردست ملی بھگت سے اس ٹھیکہ کے لئے کچھ قانون وضع کئے گئے جو کسی بھی ٹھیکیدار کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے مثلاً۔

(۱) ٹھیکیدار ایڈوانس قسط کے ساتھ ہی ناکہ نشینوں انسپکٹروں اور بیٹے والوں وغیرہ کی ایک ماہ کی تنخواہ بھی ٹاؤن کمیٹی کو پیشگی جمع کرائے گا۔ جو مہینے بعد ٹاؤن کمیٹی اس عملہ کو خود تقسیم کرے گی۔

(۲) ٹھیکیدار کو کسی بھی منشی یا پٹہ دار وغیرہ کو کسی بھی صورت میں نکالنے کا حق نہیں ہوگا (چاہے انسپکٹر اور منشی ٹھیکیدار کا دیوالہ نکال دیں)

(۳) چنگیوں پر ٹاؤن کمیٹی کے ناپ تول کے سامان اور فرنیچر کو ٹھیکیدار استعمال نہیں کرے گا بلکہ خود اپنا سامان لائے گا۔

کنری کا کوئی شخص سخت قوانین کے خوف سے حصہ ہی نہیں لینا چاہتا تھا۔ باہر سے کچھ لوگ ٹھیکہ لینے آئے مگر مقامی ٹاؤن کمیٹی کے ارکان کی ملی بھگت اور اسلام پسندوں نے زبردست پروپیگنڈہ کیا کہ اس ٹھیکے میں پہلے ٹھیکیدار نے بھی نقصان سے بولی میں حصہ لینے سے روکنے کی کوشش کی اور اس وقت تک ان کے ساتھ لگے رہے جب تک ان کے ساتھ لگے رہے جب تک کہ وہ کنری سے چلے گئے کیونکہ بصورت دیگر بھانڈہ پھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ نیلامی جب شروع ہوئی تو باہر سے آنے والے اس قدر خوف زدہ تھے کہ بجائے بولی لگانے کے خاموش بیٹھے رہے اسلام پسندوں نے دو گروہ تیار کئے تھے اور دونوں گروہ ایک دوسرے کے مقابلے میں بولی دیتے رہے اور آخر تقریباً سوا چار لاکھ روپے میں ٹھیکہ لے لیا۔ یعنی گذشتہ سال سے تقریباً پچھتر ہزار روپے کم میں جب کہ پچھلے سال چنگی کے محصول ساتھ وہیل ٹیکس وغیرہ شامل نہیں تھا، بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ پچھلے سال سے ایک لاکھ روپے کم میں اس سال کنری کا ٹھیکہ نیلام ہوا۔

نیلامی سے قبل ٹاؤن کمیٹی نے جو اسپیشل قانون ٹھیکیدار کے لئے ترتیب دیئے تھے۔ وہ اب منسوخ کر دیئے گئے ہیں کیونکہ ان قوانین کے بنانے کا مقصد صرف موجودہ اسلام پسند ٹھیکیدار کو ٹھیکہ دلوانا تھا جو عوام اور ملک کی خدمت کے نعروں اور چکنی چپڑی باتوں کے طفیل ٹاؤن کمیٹی کو ایک لاکھ روپے کا خسارہ دینے کے باوجود اب ٹیکس لینے میں بھی اپنی من مانی کر رہا ہے۔ جس غریب کو چاہیں، ۱۰ ، ۱۱ گنا محصول تھوپ دیں۔ اگر کوئی قسمت کا مارا باہر سے کوئی سامان لائے تو ناکہ پر کیش میمو دیکھ کر اس کی رسید نہیں کاٹی جاتی بلکہ شہر کے مرکز میں بس اسٹاپ تک اپنے کسی آدمی کو ساتھ بھیجا جاتا ہے یہاں موجود ناکہ منشی بھی اس سامان کی رسید نہیں کاٹتا بلکہ اس شخص کو کہا جاتا ہے یہاں موجود ناکہ منشی بھی اس سامان کی رسید نہیں کاٹتا بلکہ اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ ٹھیکیدار آ کر مال چیک کرے گا۔ تب محصول لیا جائے گا۔ اور پھر سارے شہر میں ٹھیکیدار کو تلاش کیا جاتا ہے قسمت اچھی ہو تو ٹھیکیدار جلد آ جاتا ہے، ورنہ چار چار گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے پھر اس سامان کو کھلوایا جاتا ہے اور ایک ایک چیز کی الگ الگ گنتی کی جاتی ہے اس سامان کی قیمت کا تخمینہ لگایا جاتا ہے تب رسید بنتی ہے اور سامان لانے والے کی خلاصی ہوتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سامان جس بھاؤ حیدرآباد یا کراچی سے خریدا جاتا ہے۔ اس کے مطابق محصول نہیں لیا جاتا بلکہ کنری میں یہ سامان جس خوردہ قیمت پر بکتا ہے اس حساب سے محصول وصول کیا جاتا ہے۔

میرپور یا حیدرآباد سے کوئی شخص ذاتی استعمال کے لئے ایک آدھ جوڑا کپڑا یا ریڈی میڈ کپڑے لے آئے، بچوں کے لئے کھلونے یا ایسی کوئی دوسری چیز لائے تو اس کا بھی ٹیکس لیا جاتا ہے جب کہ کہیں

بھی ایسا اندھا قانون نہیں باہر سے آنے والوں کے پاس چاہیے کچھ نہ ہو مگران کا سارا سامان کھلوایا جاتا ہے بکسوں اور بستروں کے کپڑوں اور سامان کی ایسی تلاشی لی جاتی ہے کہ بندرگاہ اور ہوائی اڈوں پر غیر ممالک سے آنے والوں کی بھی نہیں لی جاتی ۔

آج کل ٹھیکیدار نے اپنا ایک نیا قانون بنایا ہے کہ لوسن اور بریسم (گھاس) کا بیج جو اجناس میں شمار ہوتا ہے اور اس کا ٹیکس وزن پر لیا جاتا ہے ۔ اب وزن کے بجائے قیمت پر لیا جانے لگا ہے یعنی لوسن اور بریسم کے بیج کو سبزیوں اور فروٹ کے بیجوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اگر یہی حالت رہی تو مستقبل میں ٹھیکیدار صاحب گندم چاول ۔ چنا ، مکئی باجرہ جوار وغیرہ اجناس کو بھی اس خانے میں داخل کرکے وزن کے بجائے قیمت پر ٹیکس لینا شروع کر دیں گے کیونکہ ویسے تو یہ بھی آخر بیج ہی ہیں اور شاید عوام اور ملک کی خدمت کا تقاضا بھی یہی ہے ۔ آج کل مرچوں کا موسم ہے اور روزانہ ہزاروں بوری مرچ مارکیٹ میں آرہی ہے اسلام پسند ٹھیکے دار نے مرچوں پر وزن کے بجائے قیمت پر محصول رکھا ہے جو زمیندار اور کسان پر زبردست ظلم ہے اس پر ٹھیکیدار کا مزید ظلم یہ کہ مارکیٹ میں زیادہ سے زیادہ بھاؤ ایک سو روپیہ فی من ہو تو ٹھیکیدار صاحب ہر آنے والی مرچ کا بھاؤ ایک سو دس روپے لگا کر ٹیکس وصول کرتا ہے چاہے منڈی میں یہی مرچ اسی روپے کے بھاؤ بکے ۔

ہر شہر میں قانون ہے کہ باہر سے آنے والے پھیری والوں سے آٹھ آنے یا جو وہاں مقرر ہو پھیری کا ٹیکس لیا جاتا ہے مگر یہاں ایسا نہیں پورے سامان کی اپنی مرضی سے قیمت لگا کر اس کا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے ۔ چاہے پھیری والے کا سامان بکے یا نہ بکے چاہے غریب پھیری والا سارا سامان واپس لے جائے ٹھیکیدار صاحب کو اس سے کوئی واسطہ نہیں کچھ لوگ باہر دیہاتوں میں اپنی گائے بھینس یا بکری دودھ سوکھ جانے پر بھیج دیتے ہیں اور جب وہ دودھ دینے لگے تو لے آتے ہیں مگر اس صورت میں بھی ٹھیکیدار اپنا ٹیکس ضرور وصول کرتا ہے چاہے اس جانور کو خریدے دس سال ہو چکے ہوں

کیا حکومت ٹھیکیداروں کو ایسے ٹھیکے دینے کے ساتھ عوام کا خون چوسنے کا بھی ٹھیکہ دیتی ہے ؟

◆

ٹھٹھہ

بیڑی کی صنعت کو کون غرق کر رہا ہے ؟

محمد رمضان

بیڑی کی صنعت کا شمار پاکستان کی اہم گھریلو صنعت میں ہوتا ہے ۔ سندھ کی اکثریت بیڑی کو استعمال کرتی ہے سندھ کے لاکھوں مزدور اس صنعت سے وابستہ ہیں ۔ بیڑی کے سیٹھ جو کل تک معمولی سرمایہ دار تھے آج بڑے سرمایہ داروں میں شمار ہوتے ہیں حکومت نے مشرقی پاکستان سے بیڑی کا پتا منگوانے کا پرمٹ بھی ان ہی کو دیا ہے اس پرمٹ کی بدولت ان کی تجوریاں جتنا حجم بڑھتا جا رہا ہے اتنی ہی ہوس دولت بڑھتی جا رہی ہے اور بیڑی کے خالقوں ۔ بیڑی کے مزدوروں کی حالت دن بدن پتلی ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے وہ فاقے کاٹنے پر مجبور ہیں ۔

جب سے مشرقی پاکستان سیاسی بحران میں مبتلا ہوا ہے ۔ بیڑی کے پتے کے ہول سیلرز کی بن آئی ہے من مانی قیمت وصول کی جاتی ہے اگر کوئی اعتراض کرے تو جواب ملتا ہے " ہم کو نقصان ہوتا ہے ہم نے مزدوروں کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہماری مرضی ہم بلیک کریں یا گراں نرخوں پر دیں اگر خریدنا ہے تو خریدو اور اگر کسی نے شور مچایا تو جو لوگ مزدوروں کو برطرف کر سکتے ہیں وہ جیل میں بھی بند کرا سکتے ہیں " ان ہول سیلرز کے پاس ۲۵۰ روپے فی بورے کے حساب سے خریدے ہوئے ہزاروں بیڑی کے پتے کے بورے گودام میں موجود تھے ۔ اب سیاسی بحران سے فائدہ اٹھا کر ۲۵ روپے فی سیر یعنی ایک ہزار روپے فی بورے کے حساب سے فروخت کر رہے ہیں ۔ اب گذشتہ دو تین ماہ سے بھاری تعداد میں بیڑی کا پتا مشرقی پاکستان سے آرہا ہے لیکن ہول سیلرز نے انہیں ذخیرہ کر لیا ہے اور نرخوں میں کوئی کمی نہیں کی جس کی وجہ سے بیڑی کی صنعت زبردست بحران کا شکار ہو گئی ہے خاص طور ضلع ٹھٹھہ میں تو بالکل تباہ ہو گئی ہے جب سیٹھ کے پاس پہلے ۲۰، ۳۰ مزدور کام کرتے تھے ، اب ایک یا دو مزدور کام کر رہے ہیں باقی سب کو برطرف کر دیا گیا ہے ۔

ضرورت اس امر کی ہے بیڑی کے پتے سے چند اجارہ دار ہول سیلرز کی اجارہ داری ختم کی جائے اور حکومت اپنے ڈیلرز مقرر کرے جو سستے داموں پر بیڑی کے محنت کش مزدوروں کو پتا مہیا کرے تاکہ وہ اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں ، اس کے ساتھ ساتھ سندھ کے بیڑی کے مزدوروں کو چاہیئے کہ اپنے حقوق کے حصول کے لئے متحد ہو جائیں ۔ اتحاد اور اتفاق ہی وہ راستہ ہے جس پر گامزن ہو کر محنت کش اپنے بنیادی حقوق حاصل کر سکتے ہیں ۔

سرگودھا

نظر بند مزدور کسان رہنماؤں پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلاؤ

نمائندہ الفتح

صوبہ سرحد کے مظلوم کسانوں پر خوانین کے بڑھتے ہوئے مظالم مزدور کسان پارٹی کے رہنماؤں کی گرفتاریوں ، کارخانوں سے مزدوروں کی برطرفیوں اور کسانوں کی بے دخلیوں نے عوامی حلقوں اور ملک میں بے چینی و اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔ پاکستان پیپلز پارٹی ضلع سرگودھا کے صدر چوہدری ممتاز احمد کاہلوں (ایم پی اے) نے ایک اخباری بیان میں مزدور کسان پارٹی کے صدر جناب اسحاق محمد اور ان کے تمام ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے ۔ انہوں نے کہا ہے کہ جاگیردار ، سرمایہ دار اور مل مالکان محنت کش عوام پر بے انتہا مظالم ڈھا رہے ہیں مزارعین کی بے دخلیاں اور مزدوروں کی چھانٹیاں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں ۔ اس لئے جب کسان مزدور رہنما اور مزدور ومزارعین اپنے جائز اور قانونی حقوق کے لئے جدوجہد کرتے ہیں تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہیں اور اگر اس کے علاوہ مزدور کسان پارٹی کے رہنماؤں کا کوئی جرم ہے تو حکومت کو کھلی عدالت میں ان

پر مقدمہ چلانا چاہیئے انہوں نے مزید کہا کہ اخباری اطلاعات کے مطابق مزدور کسان پارٹی کے رہنماؤں سے جیلوں میں ناروا سلوک برتا جا رہا ہے ہر مہذب ملک میں سیاسی رہنماؤں سے جیلوں میں اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے حکومت کو چاہیئے کہ وہ انہیں جیل میں "اے کلاس" دے۔

کھپرو

صحافیوں کو
مت چھیڑو۔ باز آؤ

نیاز احمد

انجمن صحافیان ضلع تھرپارکر نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ضلع تھرپارکر کی انتظامیہ عوام درست اخبار نویسوں کو طرح طرح سے تنگ کر رہی ہے۔ سماج دشمن عناصر بھی ان کی جان کے درپے ہیں۔ اور انہیں قتل کروانے اور جھوٹے مقدمات میں پھنسانے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں گذشتہ چھور کے اخبار نویس گل حسن آولیبر کو کچھ اسمگلروں اور سماج دشمن عناصر نے دھمکیاں دیں۔ [illegible] صحافی جناب خدا بخش منگریو کو مقامی ایس ایچ او نے گرفتار کر کی دھمکی دی گئی ہیں روزنامہ ہلال پاکستان کے نمائندے غلام محمد کو مخالف سیاسی جماعتوں کے افراد طرح طرح سے تنگ کر رہے ہیں کھپرو میں بھی روزنامہ ہلال پاکستان کے نمائندے محمد رحیم کو دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ خیرپور، ڈگری اور شادی پور چاکر کے صحافیوں کو بھی اسی قسم کی شکایات ہیں مقامی اور ضلع کی انتظامیہ سے متعدد بار شکایت کی گئی۔ لیکن ابھی تک کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ انجمن صحافیان ضلع تھرپارکر کے صدر جناب سید غلام رسول شاہ نے گورنر سندھ کی توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ صحافیوں کے حقوق اور جان و مال کا تحفظ کیا جائے اور انہیں دھمکیاں دینے والوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

شمالی ہشت نگر کی
عوامی گھن گرج کراچی میں

۳۱۔ اکتوبر کو شمالی ہشت نگر کمیٹی کا تیسرا ہفتہ واری اجلاس زیر صدارت محمد شفیع لیاری میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں ترقی پسند پارٹیوں کے کارکنوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اور ہشت نگر کے جیالے کسانوں کی جائز اور منصفانہ جدوجہد کی حمایت کرتے ہوئے خوانین سرحد اور نوکر شاہی کے خلاف اپنی بھرپور نفرت اور غصہ کا اظہار کیا۔ کارکنوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ شمالی ہشت نگر کے جیالے کسانوں کی جدوجہد کے چراغ کو جگہ جگہ روشن کریں گے اور اس کا سیاسی پروپیگنڈہ کرنے میں بھرپور حصّہ لیں گے۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ بائیں بازو کے ممتاز رہنماؤں سے کمیٹی کے افراد ملاقات کرنے کے بعد ان کو شمالی ہشت نگر کے جیالے کسانوں کی اخلاقی و مادی امداد کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر زور دیں گے۔

ناصر شہید

موسم نئی حیات کا آئے گا ساتھیو
یعنی نیا نظام بھی لائے گا ساتھیو

فرعونیت سے لڑتے ہوئے مر گئے جو لوگ
اُن کا لہو بھی رنگ دکھائے گا ساتھیو

کچھ لوگ آدمی کے خدا بن گئے ہیں کیوں
تاریخ کا عمل یہ بتائے گا ساتھیو

جس کی نظر میں شب کا اُجالا فریب ہے
وہ ہی لہو کے دیپ جلائے گا ساتھیو

ناصر شہید جس کے لئے خون دے گیا
ہاں وقت انقلاب وہ لائے گا ساتھیو

سحر انیس

کنیز کی گیارہ گھنٹے کی محنت صرف ۸۰ پیسے میں فروخت ہوتی ہے

آٹھ افراد — دو کمانے والے - آمدنی صرف ۹۹ روپے ماہوار

کراچی صرف سوسائٹی اور ناظم آبادوں کا نام نہیں ہے۔ یہاں اور بھی آبادیاں ہیں جہاں اس ملک کی اکثریت بستی ہے۔ روشنیوں کے پہلو میں اندھیرے سسک رہے ہیں۔ اُن اندھیروں میں جھانک کر مس احتشام زریں فاروقی ایک کہانی لائی ہیں، وہ آئندہ بھی "الفتح" کے لیے ایسی کہانیاں تلاش کرتی رہیں گی (ادارہ)

احتشام زرّیں فاروقی

صاحب ناظم آباد نمبر ۲ میں یعنی چورنگی نمبر ایک سے لے کر چورنگی نمبر دو تک دائیں طرف اچھے کھاتے پیتے گھرانے آباد ہیں، یہاں پر ایسے مکان بہت کم ہیں جن کی چھتوں پر ٹی وی کے "اینٹینا" نہیں لگے ہوتے ہیں، ہر دوسرے یا تیسرے مکان کے سامنے ایک کار بھی کھڑی نظر آتی ہے۔ دو منزلہ مکانوں کے آگے کاریں بھی دو ہوتی ہیں، اور اکثر دو سے زیادہ بھی، یہاں کے مکانوں میں بڑے بڑے لان تو نہیں ہیں، پھر بھی درمیانے سائز کے باغیچے موجود ہیں اور باغبانی سے شوق رکھنے والے رات رات بھر کے لئے پانی لگا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسی ہی خوشنما بستی سے ملا ہوا گندی نالیوں اور بوسیدہ جھگیوں کا ایک جہان آباد ہے۔ اس علاقے میں گلیاں اتنی تنگ ہیں، کہ ایک ساتھ دو آدمی تو نکل ہی نہیں سکتے، اور کچھ گلیاں تو ایسی بھی ہیں جن میں سے ایک آدمی بھی آڑا ہو کر گزر پاتا ہے۔

ایسی جگہوں پر اکثر خدمت خلق کے جذبے سے سرشار بیگمات انگریزی سینٹ میں ڈوبا ہوا رومال ناک پر رکھ کر آتی ہیں اور لوگوں کو صاف رہنے اور ابلا ہوا پانی پینے کی تاکید کرتی ہیں، جبکہ ان بے چاروں کے پاس پکانے کے لئے مٹی کا تیل پورا نہیں ہوتا، رہی صاف رہنے والی بات تو، لوگ اگر پندرہ بیس دن میں ایک بار بھی نہا سکیں تو بڑی بات ہے، پانی ان کے لئے بڑی قیمتی چیز ہے۔ نہ جانے کتنی مشکل سے وہ دو تین کنستر پانی حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی میں ان کو سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ کنیز بھی یہیں رہتی ہے اس کے خاندان میں کل آٹھ افراد ہیں۔ چھ بچے ایک شوہر اور ایک خود یہ عورت ان بدنصیبوں میں سے ایک ہے جن کے ہاتھ سوائے مفلسی کے کچھ نہ آیا۔ کنیز لچکے گوٹے کی تین پیٹیوں کو جوڑ کر ایک چوڑی پٹی تیار کرتی ہے اور بیچ والی دھنک بھی خود بناتی ہے۔ ساڑھے سات گز گوٹا بنانے کی اجرت اسے صرف بیس پیسے ملتی ہے۔ اگر وہ دس گیارہ گھنٹے کی مسلسل محنت سے چار گولے یعنی تیس گز گوٹا بناتی ہے۔ تب کہیں اسے اسی پیسے ملتے ہیں۔ ایک روپے میں بھی بیس پیسے کم، یہی گوٹا بازار میں ڈیڑھ روپے گز کے حساب سے بکتا ہے۔ ساڑھے سات گز گوٹا نو روپے چھ آنے کا ہوا۔ کنیز کو لچکے کے پھول بنانے کی مزدوری پچیس پیسے ملتی ہے، اگر وہ ایک تولہ پھول بناتی ہے تو پچیس پیسے بنتے ہیں اور بازار میں یہ پھول بارہ آنے تولہ ملتے ہیں۔ کنیز کا شوہر گرمیوں میں قلفی اور جاڑوں میں مونگ پھلی بیچتا ہے، اسے دمہ کا مرض ہے اور بیماری کے دنوں میں کام نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی سارے دن میں ڈھائی تین روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔ کے۔ ایم۔ سی کے ہسپتال سے جو دوا ملتی ہے۔ اس سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے پرائیوٹ ڈاکٹروں کو دینے کے لئے بھی کچھ پیسے درکار ہوتے ہیں، ہر مہینے کنیز کا شوہر پچیس دن کام کرپاتا ہے اور تین روپے روز کے حساب سے پچھتر روپے مہینے میں ملتے ہیں، چوبیس روپے کنیز کی آمدنی ملا کر ننانوے روپے بنتے ہیں۔ ان پیسوں میں آٹھ آدمیوں کو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے کھانا بھی چاہیئے اور جسم چھپانے کے لئے کپڑا بھی اور دس روپے مہینہ جھونپڑی کا کرایہ بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اناسی روپوں میں گھر کا خرچ چلانا ہوتا ہے اور اس طرح ایک آدمی کے حصے میں گیارہ روپے اور بارہ پیسے آتے ہیں۔ اف ان کے شب و روز کتنے کٹھن ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی ایک خوشی کے لئے لاکھوں روپے پھینک دیتے ہیں اور ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ایک روٹی کی خاطر اپنے جسم و جاں کی بازی لگا دیتے ہیں اور ہمارے ملک میں ان لوگوں کی کمی نہیں ہے۔

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں۔



قارئین کہتے ہیں

اِسے کسان کی محنت کا صلہ کہوں یا مزدور کی اُجرت ؟

رسالہ "الفتح"، کا ہر شمارہ ایک نئی بات نیا رنگ اپنے جلو میں لے کر آتا ہے۔ آپ کی کاوش قابل داد ہوتی ہے مضامین کے انتخاب میں آپ کافی محنت کرتے ہیں یہی ہماری اس میں سب سے بڑی دلچسپی کا باعث بنتا ہے اتنے کم صفحات میں بھی آپ بہت کچھ دلچسپی کا مواد جمع کر دیتے ہیں۔ آپ کا "الفتح" رسالہ زیر نظر ہے حیران ہوں کہ اس کو ایک جاگیردار کے کھیت پر کاشت کرنے والے کسان کی محنت کا صلہ کہوں یا مشینوں کا جگر چیرنے والے مزدور کی اجرت کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ مختصر لفظوں میں یوں کہ آپ جن حالات میں اس قدر جامع پرچہ نکال رہے ہیں صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ نگارشات اور مستقل سلسلوں کے لئے عرض ہے (گستاخی معاف) کہ ضیاء سعدی کی یادداشتیں سنو آواز آ رہی ہے، روزنامہ غالب سے روزنامہ جنگ تک اور پردہ چاک کو برقرار رکھیں باقی دوسرے سلسلے بند کر کے کوئی اور نئے دلچسپ قسم کے سلسلے شروع کئے جائیں جو زیادہ سے زیادہ تین مہینے تک چلائیں اور پھر بدل دیں۔ کچھ بھارتی پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے آپ بھی کچھ نہ کچھ مزیدار سا کالم دیا کریں امید ہے کہ آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے "الفتح" کے لئے اپنی نگارشات ارسال ہیں۔ آپ میرے لکھنے کے ذوق کی آبیاری کریں گے۔؟

کلیم اشرف کلیمی۔ جوائنٹ سیکرٹری،
پاکستان جرنلسٹ گلڈ۔ کراچی)

پبلشر انٹر کانٹی نینٹل میں۔ اور شاعر فٹ پاتھ پر

۱۴ اکتوبر کے "الفتح" میں میرا افسانہ شائع ہوا۔ اس کا علم مجھے اپنے ایک دوست کی معرفت ہوا معمول کے مطابق جب میں اگلے دن پرچہ خریدنے گیا تو سٹال پر "الفتح" کا کوئی پرچہ موجود نہ تھا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ شاید دفتر والوں کو خیال آ جائے اور اور پرچہ روانہ کر دیں مگر آج ۲۱ تاریخ ہونے پر بھی پرچہ نہیں پہنچا۔ اور اب آپ کو اس امر کی اطلاع دے رہا ہوں۔

آج کل پاکستان میں کوئی پرچہ چاہے وہ ادبی ہو سیاسی ہو یا فلمی ہو لکھنے والوں کو کوئی معاوضہ ادا نہیں کرتا۔ اور حالات کی خرابی کا بہانہ بنا دیا جاتا۔ حالانکہ حالات ہمارے ہمسایہ ملک بھارت میں بھی ہم سے اچھے نہیں ہیں مگر وہاں تقریباً تمام رسالے لکھنے والوں کو کافی پیسے دیتے ہیں نتیجہ صاف ظاہر ہے پاکستان میں کوئی رسالہ ایسا نظر نہیں آتا جس میں چھپنے والے تمام مضامین وغیرہ معیاری ہوں۔

ہمارے قابل لوگوں کی اکثریت غریب لوگوں پر مشتمل ہے اب آپ ان قابل لوگوں سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ بھوکے مر کر آپ کے رسالوں کا پیٹ بھرتے رہیں چنانچہ وہ بیچارے کبھی کبھار اپنے نام کی خاطر چند جملے لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ملک میں حالت یہ ہے کہ پبلشرز اور ایڈیٹرز تو لاکھوں سے کھیلتے ہیں اور لکھنے والے اکثر اوقات فاقے کرتے ہیں۔

اس دن مجھے رونا آیا جس دن "نقوش" کے ایڈیٹر لاہور انٹر کانٹینٹل میں غالب نمبر کی تقریب منا رہے تھے اور نقوش میں لکھنے والا ایک شاعر جس کی غزلیں پاکستان کے ہر ادبی پرچے میں ہر ماہ شائع ہوتی ہیں، بھوکا تھا۔

ساجد منصور قیصرانی
ڈیرہ غازیخان

سرمایہ داروں نے گڑبڑ کی تو

ہم آپ کے ساتھ ہیں

۲۸ اکتوبر کے شمارے میں "الفتح" نے "پاکستان کے سرمایہ دار معاشرے پر الفتح کا پہلا حملہ" کے عنوان سے جو حقائق بیان کئے ہیں اس پر ہم الفتح کے تمام ارکان اور عبدالحمید چھاپرا کو مبارک باد دیتے ہیں اور انہیں یہ یقین دلاتے ہیں کہ اب ہم قارئین بھی کوشش کر کے ایسے حقائق "الفتح" کو پہنچائیں گے۔ اس لئے کہ یہی ایک پرچہ ہے جو غریب عوام کا ہمدرد اور سرمایہ داروں کے لئے "ہتھوڑے" کی حیثیت رکھتا ہے ان حقائق کے بعد سرمایہ دار اس پرچے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے مگر ہم قارئین ادارہ "الفتح" کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ ایسا کوئی وقت پڑا تو ہم اس پرچے کو بچانے کے لئے سرمایہ داروں سے نبرد آزما ہو جائیں گے

غلام مجتبیٰ عہدی ۱۸/۲ ۸۰۲ فیڈرل "بی"
ایریا کراچی ۳۸۔

اس ہفتہ کی اہم خبریں

۳۲ اعلیٰ سرکاری افسروں کے اعزازات واپس لے لئے گئے

اسلام آباد ۳۰۔ اکتوبر حکومت پاکستان نے ۳۲ اعلیٰ سرکاری افسروں کے اعزازات واپس لے لئے ہیں جن میں تین سابق مرکزی سیکرٹری بھی شامل ہیں۔ مرکزی سیکرٹریوں کے نام یہ ہیں ڈبلیو اے شیخ سابق سیکرٹری صحت، محنت و سماجی بہبود (ستارہ پاکستان ستارہ قائد اعظم) ایس ایس جعفری (ستارہ پاکستان، ستارہ قائد اعظم) ابونصر (ستارہ پاکستان، ستارہ قائد اعظم) الطاف حسین گوہر (ہلال قائد اعظم، ستارہ پاکستان ستارہ قائد اعظم۔ تمغہ پاکستان)

شیخ مجیب کو رہا کرنے کی تردید

کراچی ۲۔ نومبر۔ سرکاری ذریعوں نے امریکی جریدہ نیوز ویک اور برطانوی اخبار ڈیلی میل میں صدر یحییٰ کے انٹرویو کے اس حصہ کی حتمی طور پر تردید کی ہے۔ جس میں صدر پاکستان سے منسوب کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر قوم نے مطالبہ کیا تو وہ شیخ مجیب الرحمان کو رہا کر دیں گے۔

فی چیک بیس پیسے

کراچی ۳۔ نومبر پاکستان کے تمام بنک یکم دسمبر سے بیس پیسے فی چیک کی شرح سے ایکسائز ڈیوٹی وصول کرنا شروع کر دیں گے۔

جماعت اسلامی کے کارکنوں کی غنڈہ گردی

کراچی ۳۔ نومبر جماعت اسلامی کے کارکنوں نے جو مشرقی پاکستان کے وزیر تعلیم جناب عباس علی خان کے استقبال کے لئے ائیرپورٹ پر جمع تھے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو زدوکوب کیا۔ اس ہنگامے میں سید سعید حسن کی بیگم کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اور جماعتی غنڈوں نے ان پر تشدد کیا۔

پاکستان پر سب کچھ قربان کردوں گی

راولپنڈی ۳۔ نومبر مادام نورجہاں نے کہا۔ کہ اگر بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو میں اپنا سب کچھ ملک پر قربان کر دوں گی۔ میری دولت، جان بچے وطن کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے،

پاکستانی وفد پیکنگ پہنچ گیا'

پیکنگ:۔ ۵ نومبر ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پاکستان کا اعلیٰ اختیارات کا وفد حکومت چین کی دعوت پر آج پیکنگ پہنچ گیا۔ پاکستانی وفد نے پیکنگ پہنچنے کے فوراً بعد چینی وزیراعظم سے بات چیت شروع کر دی سرکاری وفد میں مسلح افواج کے اعلیٰ افسر گئے ہیں۔

چین پاکستان کے ساتھ ہے

پیکنگ، ۷۔ نومبر۔ "پاکستان پر اگر کوئی بیرونی حملہ ہُوا تو چین پاکستان کی بھرپور امداد کرے گا" یہ بات چین کے قائم مقام وزیر خارجہ مسٹر چی پنگ فی نے ایک ضیافت کے دوران کہی انہوں نے کہا کہ پاکستانی عوام کی اکثریت متحدہ پاکستان کی حامی ہے۔ وہ بیرونی حملہ آوروں، مداخلت کاروں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں"

بقیہ: ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

تھی کیونکہ چین اور پاکستان کے تعلقات مسٹر بھٹو کی وزارت کے زمانے میں ہی عروج پر پہنچے اور پھر وزیر اعظم چواین لائی نے ایک بار یہ بھی کہا تھا کہ ہم اب اس وقت پاکستان آئیں گے جب عوامی حکومت قائم ہو جائے گی، اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ مسٹر بھٹو عوام کی مدد سے برسر اقتدار آئیں گے اس بات کو چینی حکومت نے نبھایا بھی کیونکہ اس پانچ چھ برس کے عرصے میں کسی ممتاز چینی رہنما نے پاکستان کا دورہ نہیں کیا۔ حالانکہ اگست میں روس بھارت معاہدہ اور روسی وزیر خارجہ گرومیکو کے دورہ کے بعد پاکستان میں ڈپلومیٹک جواب کے طور پر کسی ممتاز چینی رہنما کے دورے کا انتظار کیا گیا، سرکاری لابی نے یہ خبر بھی چلائی کہ چواین لائی پاکستان کا دورہ کر رہے ہیں۔

اب موجودہ وفد کی تشکیل کا وقت آیا تو اس میں بھی سفارتی انداز سے ضروری تھا۔ کوئی سیاسی اور نمائندہ شخصیت ساتھ جاتی، اس کے لئے مسٹر بھٹو سے زیادہ موزوں کوئی شخصیت نہیں تھی، ایک عرصہ سے چینی سفارتی افسر بھی ان سے مل رہے تھے۔ بھٹو ایک بین الاقوامی شخصیت ہیں چین سے ان کے وزارت خارجہ کے زمانے سے گہرے تعلقات ہیں۔ اور یہ خبریں تو آ ہی چکی ہیں کہ خود چینی حکومت نے یہ دلچسپی لی تھی کہ مسٹر بھٹو اس وفد کی قیادت کریں۔ مسٹر بھٹو منتخب رکن اسمبلی ہیں اور اس وقت پاکستان میں اکثریتی پارٹی کے لیڈر ہیں۔ ان کی بھارت دشمنی اور روس دشمنی بھی واضح ہے

ہمیں ان قیاس آرائیوں سے تو غرض نہیں جو اس دورے کے بعد ملکی اور غیر ملکی پریس کی طرف سے ہو رہی ہیں کہ اب چین کے دورے کے بعد مسٹر بھٹو ملک کے وزیر اعظم بن جائیں گے۔

ہمیں یہ احساس ہے کہ اب موجودہ حالات میں عوامی حکومت بنائے بغیر گزارا نہیں ہے اور اکثریت مسٹر بھٹو کے پاس ہے۔ حال ہی میں صدر یحییٰ نے ایک امریکی ٹیلی ویژن کمپنی کو جو انٹرویو دیا ہے۔ جو ابھی پاکستان میں شائع نہیں ہوا۔ اس میں صدر یحییٰ نے ایک سوال کے جواب میں یہی کہا ہے۔ کہ اکثریتی پارٹی انتخابات کے بعد ابھرے گی۔ اور وہی مرکز میں حکومت بنائے گی۔

مشرقی پاکستان میں صورت حال موجودہ حکمرانوں کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے، سول کابینہ اور بیوروکریسی دونوں ناکام رہے ہیں۔ سبوتاژ کے واقعات روز افزوں ہیں مشرقی پاکستان کے عوام کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیئے انہیں صوبائی خود مختاری ملنا ناگزیر ہے۔ اس کے لئے پیپلز پارٹی کو بھی مشرقی پاکستان میں اپنی سرگرمیاں تیز کرنا ہوں گی۔

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مشرقی پاکستان میں رضاکاروں کو از سر نو منظم کیا جائے گا اور رضاکاروں پر جو اعتراضات ہو رہے ہیں۔ انہیں دور کرنے کے لئے ایک خاص جماعت کا اثر ختم کیا جائے گا۔ چین کے سلامتی کونسل کا رکن بننے اور پاکستانی وفد کے چین کے دورے سے اب بھارت روس گٹھ جوڑ بھی خطرے میں ہے۔ ان حالات کا اثر مشرقی پاکستان کے اندرونی حالات پر بھی پڑے گا۔ اور یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔ کہ مشرقی پاکستان کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کی کوششوں کو روس اور بھارت کی حمایت حاصل ہے۔ مشرقی پاکستان کے محب وطن عوام سوشل سامراج روس اور توسیع پسند بھارت کی سازش کا شکار ہو کر اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے کی بجائے صرف طبقاتی جدوجہد کا راستہ اختیار کریں گے۔ اس طرح مشرقی اور مغربی پاکستان کے مزدور، محنت کشوں اور کسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے اور ایک ہی دشمن کے خلاف جنگ کا موقع ملے گا۔

بقیہ : جیل

سوسائٹی پر قانون کی بالادستی کا خوف طاری ہو سکتا ہے

اصلاحی نظریہ

پاکستان کی جیلوں میں اس طریقہ پر آج تک عمل نہیں کیا گیا اور عمل بھی کیوں کیا جاتا جب شروع ہی سے ہمارا رویہ جرائم کی بیخ کنی کرنے کی بجائے جرائم کی حوصلہ افزائی رہی ہے۔ جیلوں کا مقصد ایک ایسا بڑا گھر سمجھ لیا گیا ہے جہاں مجرموں کو بند کر کے ان پر تشدد کیا جائے اور طرح طرح سے جسمانی اور روحانی اذیتیں دے کر انہیں انسان سے حیوان بنا دیا جائے حالانکہ جیلوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان میں رہنے والے قیدیوں کی ایسی تربیت کی جائے کہ جب وہ اپنی سزا کاٹ کر باہر نکلیں تو وہ ایک باعزت اور باوقار شہری کی طرح دوبارہ زندگی شروع کر سکیں ہماری جیلوں کی انتظامیہ مطلق العنان اور سخت گیر ہے جیل کے اندر اس کے وضع کردہ ضابطے اور اصول ہیں ان کی پابندی نہ کرنے والے قیدیوں پر تشدد کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ایسا حیوانی برتاؤ کیا جاتا ہے کہ ان کے اندر کا انسان مر جاتا ہے اور اس کی جگہ درندہ صفت انسان جاگ اٹھتا ہے تشدد مار پیٹ اور توہین آمیز سلوک سے ان کا کردار مسخ ہو جاتا ہے۔ یہ بگڑا ہوا انسان جب جیل سے نکلتا ہے تو اس کے اندر انتقام کے جذبات تیز الاد کی طرح سلگتے رہتے ہیں وہ معاشرے کے ہر فرد سے نفرت کرتا ہے معاشرہ اسے اپنانے کے لئے تیار نہیں۔ لوگ اسے چور ڈاکو اور مجرم جیسے ناموں سے خطاب کرتے ہیں۔ اس کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ پھر جرائم کی دنیا میں واپس لوٹ جائے۔ جیل حکام کے ہاتھوں یہ کچلا ہوا انسان آگے چل کر کیا کرتا ہے اس کے ہاتھوں انسانیت جس طرح پامال ہوتی ہے، اس کا تماشہ ہم آئے دن اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں۔

سب سے پہلی فرصت میں پاکستان بھر کی جیلوں کی از سر نو اصلاح کی جائے اب تک جو حقائق سامنے آئے ہیں، ان کی روشنی میں اصلاحات نافذ کی جائیں قیدیوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا جائے جیل کے اندر ان کی تربیت کی جائے۔ ان کی انسانی صفات کو مرنے نہ دیا جائے اور قیدیوں کے حل طلب مسائل پر بلا تاخیر توجہ دی جائے پاکستان بھر کی جیلوں میں بسنے والے قیدی انسان ہیں۔ اور وہ انسانوں جیسے سلوک کے مستحق ہیں۔ ان بااثر افراد کو عبرتناک سزائیں دی جائیں جو انہیں انسان سے حیوان بنانے پر تلے ہوئے ہیں

بقیہ : حسن ناصر کا مقدمۂ شہادت

کے لئے ۲، دسمبر کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اسی دوران حسن ناصر کی والدہ مسز زہرہ علمبردار حسین کا ایک ٹیلی گرام ملا کہ وہ نعش کو نکلوانے کے لئے لاہور رہی ہیں۔

اب حالات نے نیا رخ اختیار کر لیا ماں اپنے بیٹے کی نعش بطور حق طلب کر سکتی تھی اور کوئی عدالت بھی اسے اس حق سے محروم نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لئے مقدمہ حسن ناصر کی والدہ کی آمد تک ملتوی کر دیا گیا جسٹس شبیر احمد کی غیر موجودگی میں جسٹس ایس اے محمود نے ۷، دسمبر ۱۹۶۰ء کو یہ فیصلہ سنایا۔

"مسٹر انور کا کہنا ہے کہ حسن ناصر جو لاہور قلعے میں فوت ہو گئے اور جن کو میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا، ان کی نعش کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرانے میں انہیں اور حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ان کی والدہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۰ء کو ٹھیک دس بجے نعش کو نکلوانا چاہتی ہیں۔ میں حکم دیتا ہوں کہ ڈاکٹر امیر الدین، مسٹر ریاض قدیر، موقع پر یا جہاں انہیں سہولت ہو حسن ناصر کی نعش کا پوسٹ مارٹم کریں گے دونوں فریقین اس بات پر اتفاق کر چکے ہیں ڈاکٹر صدیق حسن بھی موجود رہیں گے۔۔۔۔۔"

۱۲ دسمبر کو نعش کو قبر سے نکالنے کا کام اس لئے ملتوی کر دیا گیا کہ حسن ناصر کی والدہ مسز علمبردار حسین پوسٹ مارٹم کے فوراً بعد اپنے بیٹے کی نعش کو ہندوستان لے جانا چاہتی تھیں۔ انتظامات کے لئے وقت درکار تھا۔ اس کام کے لئے ایک "ایئر ٹائٹ" صندوق کا حصول ضروری تھا۔ اس کے علاوہ نعش کو پاکستان سے لے جانے کے لئے حکومت پاکستان اور بھارت میں داخلہ کے لئے حکومت بھارت سے پیشگی اجازت بھی حاصل کرنی تھی۔ اس کے بعد ٹرانسپورٹ کے انتظام کا بھی سوال تھا۔

جس دن ہائی کورٹ نے حکم دیا، اسی دن سے حیرت انگیز باتیں وقوع پذیر ہونے لگیں۔ اسی دن صبح کو ڈی، آئی، جی سی آئی ڈی نے میانی صاحب کے قبرستان کی ایک قبر کی طرف اشارہ کیا کہ یہ ان کے لڑکے کی قبر ہے۔ انہیں قبر کے محل وقوع کو خفیہ رکھنے کی قسم دلائی گئی۔ ان سے کہا گیا کہ "اگر یہ بات ظاہر ہو گئی تو ممکن ہے کمیونسٹ شرارت کریں"۔ شام میں جب تاریکی پھیل گئی تو وہ قبرستان کی طرف سے گذریں۔ ان کے دل میں بیٹے کی قبر پہ فاتحہ پڑھنے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ انہوں نے جوں ہی اپنی کار موڑی، "ہیڈ لائٹ" کی روشنی میں عجیب و غریب منظر نظر آیا۔ انہوں نے دیکھا۔ درجن بھر وردی میں ملبوس پولیس والے اس جگہ موجود تھے۔ کچھ سادہ لباس والے اور چند گورکن بھی قبر کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ کار کی روشنی جب ان پڑی تو وہ جلدی سے قریب کی جھاڑیوں میں گھس گئے۔ چند لمحوں میں پولیس کی ایک اور گاڑی اس جگہ پہنچی، مگر ان کی گاڑی کو دیکھ کر عجلت میں فرار ہو گئی۔ دوسرے دن صبح کو انہوں نے قبر کی مٹی کو منتشر پایا۔ ایک بہشتی قبر پہ پانی چھڑک رہا تھا۔

۱۲ دسمبر ۱۹۶۰ء کو جب قبر سے نعش نکالی گئی۔ تو انہیں یہ دیکھ کر مطلق حیرت نہ ہوئی کہ وہ ان کے بیٹے کی نعش نہ تھی۔ انہوں نے نعش کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اسی دن وہ پاکستان چھوڑ کر بھارت روانہ ہو گئیں۔

(باقی آئندہ)

بقیہ : ۲۲ خاندان

لڑتے جھگڑتے خاندان کو ایک رکھنے میں بھی صرف ان کی کوششوں کا دخل ہے۔ دوسرے سرمایہ دار گروپوں میں سے کریسنٹ گروپ کو فینسی گروپ میں نمائندگی حاصل ہے۔

۱۹۵۶ اور ۱۹۵۷ء میں فینسی گروپ نے شیئر ہولڈروں کو بالکل کوئی منافع تقسیم نہیں کیا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کے گیارہ سالوں میں منافع کی اوسط شرح کبھی بھی ۱۰ فیصد سے نہیں بڑھی۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۱ء تک کے عرصہ میں کم سے کم منافع کی شرح ۶ء۳۱ فیصد تھی، اور ۱۹۵۹ء میں یہ شرح زیادہ سے زیادہ یعنی صرف ۸ء۷۷ فیصد تک پہنچ سکی۔

فینسی گروپ نے اپنی ایک ایڈورٹائزمنٹ کمپنی بھی کھولی ہے اپنی تمام کمپنیوں کے اشتہارات اور ادھر اپنے دوسرے اسمٰعیلی تاجروں کی کمپنیوں کے اشتہارات بھی ان کی کمپنی لینانگ ایڈورٹائزر نے سنبھال لئے ہیں، اس طرح ان کو کمیشن سے انتہائی معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے اپنی برادری کو انکم ٹیکس بچانے میں بے پناہ مدد ملتی ہے۔

فینسی گروپ نے گذشتہ برس پاکستان ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن پر بھی اجارہ داری حاصل کر لی ہے حکومت کے اس میں معقول حصص ہیں، فینسی نے اپنا کوئی سرمایہ نہیں لگایا۔ اس کی تفصیلات ہم الفتح کے گذشتہ شماروں میں دے چکے ہیں۔




ایورسٹ
کارپوریشن

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
11-18, NOEMBER, 1971